اصلاحی خطبات

جلد ۳

- اسلام اور جدید اقتصادی مسائل
- دولتِ قرآن کی قدر و عظمت
- دل کی بیماریاں اور طبیبِ روحانی کی ضرورت
- دنیا سے دِل نہ لگاؤ
- کیا مال و دولت کا نام دنیا ہے؟
- جھوٹ اور اس کی مروّجہ صورتیں
- وعدہ خلافی
- امانت میں خیانت
- معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟
- بڑوں کی اطاعت اور ادب کے تقاضے
- تجارت دین بھی، دنیا بھی
- خطبۂ نکاح کی اہمیت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

غزالی

اصلاحی خطبات

۳

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطبات : حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
مقام : جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال کراچی۔
تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۳ء
تعداد : دو ہزار
ناشر : میمن اسلامک پبلشرز۔ ۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹۔
باہتمام : ولی اللہ میمن۔
حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر: ۱۳۵۷۶

ملنے کے پتے

- ...... میمن اسلامک پبلشرز، ۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹۔
- ...... ادارہ اسلامیات، ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور۔
- ...... ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کراچی ۱۴۔
- ...... دارالاشاعت۔ اردو بازار۔ کراچی
- ...... کتب خانہ مظہری۔ گلشن اقبال۔ کراچی
- ...... مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد!

اپنے بعض بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں احقر کئی سال سے جمعہ کے روز عصر کے بعد جامع مسجد البیت المکرم گلشن اقبال کراچی میں اپنے اور سننے والوں کے فائدے کے لئے کچھ دین کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس مجلس میں ہر طبقہ خیال کے حضرات اور خواتین شریک ہوتے ہیں، الحمد للہ احقر کو ذاتی طور پر بھی اس کا فائدہ ہوتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ سامعین بھی فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ آمین

احقر کے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے کچھ عرصے سے احقر کے ان بیانات کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے ان کے کیسٹ تیار کرنے اور ان کی نشرواشاعت کا اہتمام کیا جس کے بارے میں دوستوں سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ان کیسٹوں کی تعداد اب غالباً سو سے زائد ہو گئی ہے۔ انہی میں سے کچھ کیسٹوں کی تقاریر مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے قلمبند بھی فرمالیں، اور ان کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اب وہ ان تقاریر کا ایک مجموعہ "اصلاحی خطبات" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

ان میں سے بعض تقاریر پر احقر نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اور مولانا موصوف نے ان پر ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ تقاریر میں جو احادیث آئی ہیں، ان کی تخریج کر کے ان کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں۔ اور اس طرح ان کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ تقریروں کی تلخیص ہے جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں، بلکہ خطابی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو ان باتوں سے فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی بات غیر محتاط یا غیر مفید ہے، تو وہ یقیناً احقر کی کسی غلطی یا کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن الحمد للہ، ان بیانات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں، بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر سامعین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

نہ بہ حرف ساختہ سر خوشم، نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیاد توی زنم، چہ عبارت وچہ معانیم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان خطبات کو خود احقر کی اور تمام قارئین کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اور یہ ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے مزید دعا ہے کہ وہ ان خطبات کے مرتب اور ناشر کو بھی اس خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی
دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للہ "اصلاحی خطبات" کی تیسری جلد آپ تک پہنچانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جلد ثانی کی مقبولیت اور افادیت کے بعد مختلف حضرات کی طرف سے جلد ثالث کو جلد از جلد شائع کرنے کا شدید تقاضہ ہوا، اور اب الحمد للہ، دن رات کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں صرف تین ماہ کے اندر یہ جلد تیار ہو کر سامنے آگئی اس جلد کی تیاری میں برادر مکرم جناب مولانا عبد اللہ میمن صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور دن رات کی انتھک محنت اور کوشش کر کے جلد ثالث کے لئے مواد تیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اور مزید آگے کام جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد حدیث جناب مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب مد ظلہم اور مولانا راحت علی ہاشمی صاحب مد ظلہم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس پر نظر ثانی فرمائی، اور مفید مشورے دیئے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان حضرات کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین اس کے علاوہ ہم مولوی محمد طارق انکی اور مولوی سفیر احمد ثاقب کشمیری کے بھی شکر گزار ہیں۔ جنہوں نے احادیثوں کے حوالوں کے سلسلے میں اور تصحیح مضامین کے سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مزید آگے جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کے لئے وسائل اور اسباب میں آسانی پیدا فرما دے۔ اور اس کام کو اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

ولی اللہ میمن
میمن اسلامک پبلشرز
لیاقت آباد۔ کراچی

اجمالی فہرست خطبات

تفصیلی فہرست مضامین

(۱۷) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل

(۱۸) دولت قرآن کی قدر و منزلت

(۱۹) دل کی بیماریاں

صفحہ	عنوان
۸۴	۱۵ ...... غصہ کی حقیقت
۸۴	۱۶ ...... غصہ نہ آنا بیماری ہے
۸۴	۱۷ ...... غصہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے
۸۵	۱۸ ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غصہ
۸۶	۱۹ ...... حد اعتدال کی ضرورت
۸۶	۲۰ ...... دل کی اہمیت
۸۷	۲۱ ...... یہ اندیکھی بیماریاں ہیں
۸۷	۲۲ ...... دل کے ڈاکٹرز صوفیاء کرام
۸۸	۲۳ ...... تواضع یا تواضع کا دکھاوا
۸۸	۲۴ ...... ایسے شخص کی آزمائش کا طریقہ
۸۹	۲۵ ...... دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا
۹۰	۲۶ ...... تصوف کیا ہے؟
۹۰	۲۷ ...... وظائف و معمولات کی حقیقت
۹۱	۲۸ ...... مجاہدات کا اصل مقصد
۹۱	۲۹ ...... شیخ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے کا واقعہ
۹۲	۳۰ ...... حمام کی آگ روشن کیجئے
۹۳	۳۱ ...... ابھی کسر باقی ہے
۹۴	۳۲ ...... اب دل کا طاغوت ٹوٹ گیا
۹۴	۳۳ ...... زنجیر مت چھوڑنا
۹۴	۳۴ ...... وہ دولت آپ کے حوالے کر دی
۹۵	۳۵ ...... اصلاح کا اصل مقصد
۹۵	۳۶ ...... اصلاح باطن ضروری کیوں؟

صفحہ	عنوان

(۲۰) دنیا سے دل نہ لگاؤ

صفحہ	عنوان

(۲۱) کیا مال و دولت کا نام دنیا ہے؟

(۲۲) جھوٹ اور اس کی مروجہ صورتیں

صفحہ	عنوان

(۲۳) وعدہ خلافی

صفحہ	عنوان

(۲۴) خیانت اور اس کی مروجہ صورتیں

صفحہ	عنوان

(۲۶) بڑوں کی اطاعت اور ادب کے تقاضے

(۲۷) تجارت، دین بھی، دنیا بھی

صفحہ	عنوان

(۲۸) خطبہ نکاح کی اہمیت

اسلام

اور

جدید اقتصادی مسائل

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم العالی
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت : ۵ر جولائی ۱۹۹۲ء ۱۱ بجے دن
مقام : سیمینار ہال، جامعہ کراچی، گلشن اقبال

بیشک "معیشت" اسلامی تعلیمات کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اور اسلام کی معاشی تعلیمات کا وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر اسلامی فقہ کی کسی بھی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے دو حصے معیشت سے متعلق ہونگے، لیکن یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دوسرے معاشی نظاموں کی طرح اسلام میں "معیشت" انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ در حقیقت اسلام کی نظر میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ دنیا جس کے اندر انسان آیا ہے یہ اس کی آخری منزل نہیں ہے بلکہ آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ایک سیڑھی ہے اور ایک عبوری دور ہے اب عبوری دور پر ساری توانائیاں اور ساری طاقت خرچ کرنا اسلامی کے بنیادی مزاج سے میل کھانے والی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام

اور

جدید اقتصادی مسائل

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ والسلام علیٰ سید نا ومولانا محمد النبی الامین وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین وعلی کل من تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔ امابعد!

آج کا موضوع

جناب صدر، و معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آج کی اس نشست کا موضوع اسلام اور جدید اقتصادی مسائل " مقرر کیا گیا ہے اور اس پر گفتگو کے لئے مجھ ناکارہ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اس موضوع کے بنیادی خدو خال آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔

یہ موضوع در حقیقت بڑا طویل الزیل اور تفصیل طلب موضوع ہے جس کے لئے ایک گھنٹے کی وسعت نہایت ناکافی ہے بلکہ مجھے یہاں "ناکافی" کا لفظ بھی ناکافی معلوم

ہو رہا ہے اس لئے تمہید سے قطع نظر کر کے براہ راست اصل موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں تاکہ اس مختصر وقت میں اپنی بساط کے مطابق اس موضوع کے چند خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں عرض کر دوں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع نہ صرف یہ کہ ایک گھنٹے کا موضوع نہیں ہے بلکہ ایک نشست کا موضوع بھی نہیں ہے، اس پر بڑی طویل کتابیں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جارہی ہیں۔ اور ایک مختصر سی نشست میں اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جدید اقتصادی مسائل اتنے زیادہ اور اتنے متنوع ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس پر بات کی جائے، اور دوسرے مسائل کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی ایک مشکل آزمائش ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ جزوی اقتصادی مسائل پر گفتگو کی جائے۔ میں اسلام کی اقتصادی اور معاشی تعلیمات کا بنیادی اور اصولی خاکہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ کم از کم اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات ذہن نشین ہو جائیں۔ کیونکہ جتنے جزوی اقتصادی مسائل ہیں جن کی طرف مجھ سے پہلے ڈاکٹر اختر سعید صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔ وہ سارے کے سارے اقتصادی مسائل درحقیقت بنیادی تصورات پر مبنی ہونگے اور ان کا جو حل بھی تلاش کیا جائے گا۔ وہ انہیں بنیادی تصورات کے ڈھانچے میں تلاش کیا جائیگا۔

لہٰذا سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے ذہن میں اسلامی معیشت کا تصور واضح ہو اور یہ بات معلوم ہو کہ اسلامی معیشت کس چیز کا نام ہے؟ اس کی کیا بنیادی خصوصیات ہیں؟ وہ کس طرح دوسری معیشتوں سے ممتاز ہے؟ جب تک یہ بات واضح نہ ہو، اس وقت تک اقتصادی مسائل پر گفتگو یا بحث یا ان کا کوئی حل منطقی طور پر درست نہیں ہو گا اس لئے میں اس وقت مختصراً اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات اور آج کی دنیا میں جاری معیشت کے نظام کے ساتھ اس کا تقابل او موازنہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائیں اور اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کو صحیح طور پر بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اسلام ایک نظام زندگی ہے

سب سے پہلی بات جو اسلامی معیشت کے حوالے سے یاد رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام در حقیقت ان ٹھیٹھ معنوں میں ایک "معاشی نظام" نہیں جن معنوں میں آج کل "معاشی نظام" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جو اس کے معنی سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اسلام ایک نظام زندگی ہے جس کا ایک اہم شعبہ معیشت اور اقتصاد بھی ہے۔ لیکن پورے اسلام کو ایک معاشی نظام کی حیثیت میں متعارف کرانا یا اسلام کو ایک معاشی نظام سمجھنا درست نہیں جیسے کیپٹل ازم ہے یا سوشلزم ہے لہٰذا جب ہم اسلام کی معیشت کا نام لیتے ہیں، یا اسلامی معیشت کے تصورات اور اس کی بنیادوں کی بات کرتے ہیں، تو ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں اور سنت رسول اللہ میں معیشت کے اسی طرح کے نظریات ہونگے، جو آدم سمتھ اور مارشل اور دوسرے ماہرین معاشیات کی کتابوں میں موجود ہیں کیونکہ اسلام اپنی ذات اور اصل میں معاشی نظام نہیں، بلکہ وہ ایک نظام زندگی ہے جس کا ایک چھوٹا سا شعبہ معیشت بھی ہے اس پر اسلام نے اہمیت ضرور دی ہے لیکن اس کو مقصد زندگی قرار نہیں دیا۔ اس لئے جب میں آگے آپ حضرات کی خدمت میں معیشت کی بات کروں گا، تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن اور سنت میں اگر کوئی شخص اس طرح کے معاشی نظریات، ان اصطلاحوں اور ان تصورات کے تحت تلاش کریگا۔ جن تصورات اور اصطلاحات کے ساتھ معیشت کی عام کتابوں میں ملتے ہیں تو اس طرح کے تصورات ان میں نہیں ملیں گے البتہ اسلام کے اندر وہ بنیادی تصورات انسان کو ملیں گے جن پر بنیاد رکھ کر ایک معیشت کی تعمیر کی جاسکتی ہے اس لئے میں اپنی ذاتی گفتگو اور تحریروں میں بھی "اسلام کا معاشی نظام" کے بجائے "اسلام کی معاشی تعلیمات" کا لفظ استعمال کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اسلام کی ان معاشی تعلیمات کی روشنی میں معیشت کی کیا شکل ابھرتی ہے؟ اور کیا ڈھانچہ سامنے آتا ہے؟ یہ سوال ایک معیشت کے طالب علم کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

"معیشت" زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ معیشت بے شک اسلامی تعلیمات کا ایک بہت اہم شعبہ

ہے۔ اور معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر اسلامی فقہ کی کسی بھی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے دو حصے معیشت سے متعلق ہونگے آپ نے فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" کا نام ضرور سنا ہوگا، اس کی چار جلدیں ہیں جس میں سے آخری دو جلدیں تمام تر معیشت کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ اس سے آپ اسلامی کی معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دوسرے معاشی نظاموں کی طرح اسلام میں معیشت انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جتنی سکولر معیشتیں ہیں، ان میں معیشت کو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے، اور اس بنیاد پر تمام نظام کی تعمیر کی گئی ہے لیکن اسلام میں معیشت اہمیت ضرور رکھتی ہے، لیکن وہ انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔

اصل منزل آخرت ہے

اسلام کی نظر میں بنیادی مسئلہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا جس کے اندر انسان آیا ہے۔ یہ اس کی آخری منزل اور آخری مطمح نظر نہیں ہے۔ بلکہ یہ آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ایک مرحلہ ہے اور ایک عبوری دور ہے اس عبوری دور کو بھی یقیناً اچھی حالت میں گزارنا چاہئے لیکن یہ سمجھنا کہ میری ساری کوششوں، ساری توانائیوں اور ساری جدوجہد کا محور یہ دنیاوی زندگی کی معیشت ہو جائے، یہ بات اسلام کے بنیادی مزاج سے میل کھانے والی نہیں۔

اسلام نے ایک طرف دنیا کو اس درجہ اہمیت دی کہ دنیاوی منافع کو قرآن کریم میں "خیر" اور اللہ کا "فضل" کہا گیا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ

(کنزالعمال حدیث نمبر ۹۲۳۱)

یعنی معیشت کو حلال طریقے سے حاصل کرنا یہ انسان کے فرائض کے بعد دوسرے درجہ کا اہم فریضہ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ اپنی تمام جدوجہد کا

محور اس دنیا کو نہ بناتا، کیونکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری ابدی زندگی آخرت کی شکل میں آنے والی ہے۔ اس کی بہبود درحقیقت انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔

دنیا کی بہترین مثال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے اس نقطہ نظر کو ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ واضح فرمایا ہے، فرماتے ہیں کہ:

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

(مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم جلد ۲ ص ۳۷)

دنیا کی مثال پانی جیسی ہے اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے جس طرح کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی۔ اسی طرح انسان دنیا اور اس کے ساز و سامان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ پانی کشتی کے لئے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک وہ کشتی کے چاروں طرف اور ارد گرد ہو، لیکن اگر یہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اس وقت وہ پانی کشتی کو سہارا دینے کے بجائے اسے ڈبو دیگا، اسی طرح دنیا کے یہ سارے ساز و سامان انسان کے لئے بڑے فائدہ مند ہیں اور اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی، لیکن یہ اس وقت تک فائدہ مند ہیں جب تک یہ دل کی کشتی کے چاروں طرف اور ارد گرد رہیں، لیکن اگر یہ ساز و سامان انسان کی دل کی کشتی میں سوار ہو جائیں تو وہ پھر انسان کو ڈبو دیں گے اور ہلاک کر دیں گے۔

اسلام کا معیشت کے بارے میں یہی نقطہ نظر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معیشت فضول چیز ہے اس لئے کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ معیشت بڑی کار آمد چیز ہے۔ بشرطیکہ اس کو اس کی حدود میں استعمال میں کیا جائے۔ اور اس کو اپنا بنیادی مطمح نظر اور آخری مقصد زندگی قرار نہ دیا جائے۔

ان دو بنیادی نکتوں کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ کسی معیشت کے بنیاد مسائل کیا ہوتے ہیں؟ اور ان بنیادی معاشی مسائل کو موجودہ معاشی نظاموں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور پھر تیسرے

نمبر ۴ یہ کہ اسلام نے ان کو کس طرح حل کیا ہے؟

"معیشت" کا مفہوم

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ معاشیات کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل چار ہیں ان چار مسائل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم جس چیز کو اکنامکس (Economics) کہتے ہیں اور عربی میں جس کا ترجمہ "اقتصاد" سے کیا جاتا ہے، اگر ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو "اکنامکس" کے معنی یہ ملیں گے کہ انسان اپنی ضرورت کو کفایت کے ساتھ پورا کر لے، "اکنامکس" کے اندر بھی کفایت کا تصور موجود ہے، اور عربی میں اس کا جو ترجمہ "اقتصاد" سے کیا جاتا ہے اس میں بھی کفایت کا تصور موجود ہے لہٰذا "اکنامکس" کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات، بلکہ خواہشات غیر متناہی ہیں۔ اور ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم اور محدود ہیں اگر وسائل بھی اتنے ہی ہوتے جتنی ضرویات اور خواہشات ہیں، تو پھر کسی علم معاشیات کی ضرورت نہ ہوتی، علم معاشیات کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات زیادہ ہیں، اور اس کے مقابلے میں وسائل کم ہیں تو اب اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ کس طرح ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے؟ جس کے ذریعہ کفایت کے ساتھ اپنی ضرویات اور خواہشات پوری ہو سکیں۔ اور یہی در حقیقت علم معاشیات کا موضوع ہے اور اس نقطہ نظر سے کسی معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ چار بنیادی مسائل ہیں۔

"ترجیحات کا تعین"

(Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ، جس کو معیشت کی اصطلاح میں "ترجیحات کا تعین" کہا جاتا ہے، یعنی ایک انسان کے پاس وسائل تو تھوڑے سے ہیں، اور ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں، اب کون سی خواہش کو مقدم کرے، اور کون سی خواہش کو مؤخر کرے۔ یہ

معاشیات کا سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں، اب ان پچاس روپے سے میں خوراک کے لئے بازار سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں، اور اس پچاس روپے سے کپڑا بھی خرید سکتا ہوں۔ اور کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے میں بھی خرچ کرسکتا ہوں۔ اور ان پچاس روپے سے کوئی فلم بھی دیکھ سکتا ہوں، اب یہ چار پانچ ضرورتیں میرے سامنے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چار پانچ اختیارات میں سے کس کو ترجیح دوں؟ اور وہ پچاس روپے کس طرح استعمال کروں؟ اس مسئلہ کا نام "ترجیحات کا تعین" ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے، اسی طرح پورے ملک، پوری ریاست اور پوری معیشت کو بھی پیش آتا ہے، مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں۔ کچھ انسانی وسائل ہیں، کچھ معدنی وسائل ہیں۔ کچھ نقدی وسائل ہیں، یہ سارے وسائل محدود ہیں، اور ہماری ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں، اب جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں، ان کے ذریعہ ہم کھیت میں گندم بھی اگا سکتے ہیں، چاول بھی اگا سکتے ہیں۔ اور تمباکو بھی اگا سکتے ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سارے وسائل عیاشی پر خرچ کر دیں۔ یہ مختلف اختیارات (Options) ہمارے سامنے موجود ہیں تو کسی معیشت کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کس طرح کریں؟ اور کس کام کو فوقیت دی جائے؟۔

۲۔ "وسائل کی تخصیص"

دوسرا مسئلہ، جسے معاشیات کی اصطلاح میں "وسائل کی تخصیص" (Allocation of Resources) کہا جاتا ہے، یعنی جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں، ان کو کس کام میں کس مقدار میں لگایا جائے؟ مثلاً ہمارے پاس زمینیں بھی ہیں، اور ہمارے پاس کارخانے بھی ہیں، ہمارے پاس انسانی وسائل بھی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کتنی زمین پر گندم اگائیں؟ اور کتنی زمین پر روئی اگائیں؟ کتنی زمین پر چاول اگائیں، اس کو معیشت کی اصطلاح میں "وسائل کی تخصیص" کہا جاتا ہے، کہ کونسے وسیلے کو کس کام کے لئے اور کس مقدار میں مخصوص کیا جائے؟

۳۔ آمدنی کی تقسیم

تیسرا مسئلہ ہے کہ جب پیداوار (Production) شروع ہو تو اس پیداوار کو کس طرح معاشرے اور سوسائٹی میں تقسیم کیا جائے؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں "تقسیم آمدنی" (Distribution of Income) کہا جاتا ہے۔

۴۔ ترقی

چوتھا مسئلہ جس کو معاشیات کی اصطلاح "ترقی" (Development) کہا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہماری جو معاشی سرگرمیاں ہیں، ان کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تاکہ جو پیداوار حاصل ہو رہی ہے۔ وہ معیار کے اعتبار سے اور زیادہ اچھی ہو جائے، اور مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہو جائے؟ اور اس میں ترقی ہو، اور نئی مصنوعات وجود میں آئیں، تاکہ مزید اسباب معیشت لوگوں کے سامنے آئیں۔

یہ چار اسباب معیشت ہوتے ہیں۔ جن کا ہر معیشت کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان چار مسائل کے تعین کے بعد ایک نظر اس پر ڈالنی ہوگی کہ موجودہ رائج الوقت معیشت کے نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟ پھر یہ بات سمجھ میں آئیگی کہ اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے کیونکہ عربی کا یہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا کہ:

و بضد ھا تتبین الاشیاء

جب تک کسی چیز کی ضد سامنے نہ آئے، اس وقت تک کسی چیز کی حقیقی محاسن سامنے نہیں آتے، اگر رات کا اندھیرا نہ ہو تو دن کی روشنی کی قدر نہ ہوتی، اگر حبس اور گرمی نہ ہو تو بارش کا رحمت ہونا معلوم نہ ہوتا۔ اس لئے مختصراً پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ رائج الوقت معاشی نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام میں ان کا حل

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کو لیا جاتا ہے، سرمایہ

دارانہ نظام نے ان چار مسائل کو حل کرنے کے لئے جو فلسفہ پیش کیا، وہ یہ ہے کہ ان چار مسائل کو حل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، ایک ہی جادو کی چھڑی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دو، اور پھر جب ہر شخص اپنا منافع کمانے کی فکر کریگا۔ اور آزاد جدوجہد کریگا تو اس وقت یہ چاروں مسائل خود بخود (Automatically) حل ہوتے چلے جائیں گے اب سوال یہ ہے کہ یہ چار مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ در حقیقت اس کائنات میں قدرتی قوانین کار فرما ہیں۔ جن کو رسد اور طلب (Supply and Demand) کے قوانین کہا جاتا ہے۔ معاشیات کے طالب علم کے علاوہ ہر عام آدمی بھی ان قوانین کے بارے اتنا جانتا ہے کہ جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور اگر طلب رسد کے مقابلے میں کم ہو جائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ بازار میں آم موجود ہیں، اور آم کے خریدار اور شوقین زیادہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں اس کی سپلائی کم ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں آم کی قیمت بڑھ جائیگی، لیکن اگر وہ آم ایسے علاقے میں پہنچا دیئے جائیں جہاں لوگ آم کھانا پسند نہیں کرتے، اور ان کے اندر آم کھانے کی طلب اور رغبت نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آم کی قیمت گھٹ جائیگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے، اور طلب کے گھٹنے سے قیمت گھٹتی ہے، یہ ایک عام اصول اور قانون ہے، جسے ہر انسان جانتا ہے

سرمایہ دارانہ (Capitalism) نظریہ کہتا ہے کہ یہی قانون جو در حقیقت اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کس مقدار میں پیدا جائے، اور کس طرح وسائل کی تخصیص کی جائے، ان سب چیزوں کا تعین در حقیقت طلب و رسد کے قانون سے ہوتا ہے، اس لئے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا، تو اب ہر شخص اپنے منافع کے خاطر وہی چیز پیدا کرنے کی کوشش کریگا جس کی مارکیٹ میں طلب زیادہ ہے۔

میں آج اگر ایک کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں، تو پہلے میں یہ معلوم کروں گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے، تاکہ جب وہ چیز میں مارکیٹ میں لاؤں تو اس کو زیادہ

قیمت میں فروخت کر کے اپنا منافع کما سکوں،

لہٰذا لوگ جب اپنے منافع کے محرک کے تحت کام کرینگے تو وہی چیز بازار میں لائینگے جس کی طلب زیادہ ہوگی، اور جب بازار میں اس چیز کی طلب کم ہو جائیگی تو لوگ اس پیداوار کو بازار میں مزید لانے سے اس لئے رک جائیں گے کہ مزید لانے کی صورت میں اس کی قیمت گھٹے گی، اور قیمت گھٹنے سے ان کا نقصان ہوگا۔ یا کم از کم منافع پورا نہیں کما سکیں گے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ طلب و رسد کے قوانین مارکیٹ میں اس طرح جاری ہیں کہ اس کے ذریعہ ترجیحات کا تعین بھی خود بخود ہو جاتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے، اور کتنی مقدار میں پیدا کی جائے، اور وسائل کی تخصیص بھی اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اپنی زمین اور اپنے کارخانے کو اس چیز کے پیدا کرنے میں استعمال کریں گے، جس کی طلب ملک میں زیادہ ہے تاکہ اس سے زیادہ منافع حاصل کر سکے، لہٰذا منافع کے حصول کے محرک کے ذریعہ ان چاروں مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد رسد اور طلب کے بنیادی قوانین ہوتے ہیں۔ اور اس سسٹم کو پرائز میکنزم (Price Mechanism) کہا جاتا ہے، اور اسی پرائز میکنزم کے تحت یہ سارے وسائل انجام پاتے ہیں۔

اسی طرح آمدنی کی تقسیم کا نظام ہے، اس کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ یہ ہے کہ رسد اور طلب کے قوانین ہی کے تحت آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے، مثلاً ایک کارخانہ دار نے ایک کارخانہ لگایا، اور اس میں ایک مزدور کو کام پر لگایا، اب سوال یہ ہے کہ کارخانے سے ہونے والی آمدنی کا کتنا حصہ مزدور وصول کرے، اور کتنا کارخانے دار حاصل کرے؟ اس کا تعین بھی در حقیقت رسد اور طلب کے قوانین کے تحت ہوگا۔ یعنی مزدور کی طلب جتنی زیادہ ہوگی۔ اس کی اجرت بھی اتنی زیادہ ہوگی، اور جتنی اس کی طلب کم ہوگی، اس کی اجرت بھی کم ہو جائے گی، تو اسی اصول پر آمدنی کی تقسیم ہوگی،

آخری مسئلہ یعنی ترقی (Development) کا مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوگا کہ جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی فکر میں ہے، تو اب وہ منافع کے حصول کے لئے نت نئی ایجادات سامنے لائے گا۔ اور ایسی چیزیں پیدا کرے گا جس کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کر سکے۔

لہٰذا جب ہر شخص کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ذریعہ

چاروں مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، انہی کے ذریعہ ترجیحات کا تعین ہوتا ہے۔ انہی کے ذریعہ وسائل کی تقسیم ہوتی ہے، انہی کے ذریعہ آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے۔ اور انہی کے ذریعہ معاشی ترقی عمل میں آتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظریہ ہے۔

اشتراکیت میں ان کا حل

جب اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے یہ کہا کہ جناب! آپ نے معیشت کے سارے اہم اور بنیادی مسائل کو بازار کی اندھی اور بہری قوتوں کے حوالے کر دیا ہے، اس لئے کہ رسد اور طلب کی قوتیں اندھی بہری قوتیں ہیں اور یہ جو آپ نے کہا کہ انسان وہی چیز پیدا کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب ہے، اور اسی وقت تک پیدا کرے گا جب تک طلب ہوگی، یہ بات نظریاتی طور پر تو چاہے درست ہو، لیکن عملی میدان میں جب انسان قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اس بات کا علم بہت مدت کے بعد ہوتا ہے کہ اس چیز کی طلب کم ہو گئی یا زیادہ ہو گئی، ایک مدت ایسی آتی ہے جس میں طلب حقیقتاً گھٹی ہوئی ہوتی ہے لیکن پیدا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ طلب بڑھی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ پیداوار میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بالآخر کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر کساد بازاری کے مہلک نتائج معیشت کو بھگتنے پڑتے ہیں، لہٰذا ان مسائل کو ان اندھی، بہری قوتوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ایک جادو کی چھڑی پیش کی تھی، اور اشتراکیت نے دوسری جادو کی چھڑی پیش کر دی کہ ان چاروں مسائل کا ایک ہی حل ہے۔ وہ یہ کہ کہ سارے وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی ملکیت میں لائے جائیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سارے وسائل پیداوار حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں، اور پھر حکومت ان وسائل کی منصوبہ بندی کرے گی کہ کتنی زمین پر گندم پیدا کی جائے، کتنی زمین پر چاول پیدا کیا جائے کتنی زمین پر روئی پیدا کی جائے، کتنے کارخانوں میں کپڑا بنے گا. اور کتنے کارخانوں میں جوتے بنیں گے، یہ ساری پلاننگ حکومت کرے گی، اور جو انسان زمین یا کارخانے میں کام کریں گے ان کی بحیثیت محنت کار کے اجرت مہیا کی جائے گی، اور اس

اجرت کی مقدار بھی پلاننگ کے ذریعے طے کی جائے گی۔ لہٰذا ترجیحات کا تعین بھی حکومت کرے گی۔ وسائل کی تخصیص بھی حکومت کرے گی آمدنی کی تقسیم بھی حکومت کرے گی اور ترقی کی منصوبہ بندی بھی حکومت کرے گی۔

چونکہ اشتراکی معیشت میں یہ سارے کام حکومت اور منصوبہ بندی کے حوالے کئے گئے ہیں، اس لئے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) بھی کہتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ معیشت نے چونکہ اپنے وسائل کو مارکیٹ کی رسد اور طلب کی قوتوں پر چھوڑ دیا ہے، اس لئے اس کو "بازاری معیشت" (Market Economy) اور عدم مداخلت معیشت (Laissez - Faire Economy) بھی کہتے ہیں۔

یہ دو مختلف نظریات ہیں، جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں، اور دنیا میں رائج ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول

سرمایہ دارنہ معیشت کے بنیادی اصول جو اس کے فلسفے سے نکلتے ہیں، ان میں سے پہلا اصول "انفرادی ملکیت" (Private Ownership) ہے، یعنی تمام وسائل پیداوار کا ہر شخص انفرادی طور پر مالک بن سکتا ہے، دوسرا اصول "حکومت کی عدم مداخلت" (Laissez - Faire Policy of state) ہے، یعنی انسان کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے، حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے، اور اس پر کوئی پابندی اور کوئی روک عائد نہ کی جائے، تیسرا اصول "ذاتی منافع کا محرک" ہے، کہ انسان کے اپنے ذاتی منافع کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا جائے، معاشی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لئے اس کی ترغیب دی جائے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول ہیں۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اس کے بر خلاف اشتراکیت کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ وسائل کی پیداوار کی حد تک "انفرادی ملکیت" کی بالکلیہ نفی کی جائے، یعنی وسائل پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے یعنی نہ کوئی زمین کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے، اور نہ کارخانہ کس کی ذاتی ملکیت ہو سکتا ہے۔ دوسرا اصول ہے "منصوبہ بندی" یعنی ہر کام پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے۔ یہ دو مختلف نظریات ہیں، جو اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اشتراکیت کے نتائج

اس وقت دنیا میں ان دونوں نظاموں کے تجربات اور نتائج سامنے آچکے ہیں، اور اشتراکیت کے نتائج آپ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ چوہتر سال کے تجربے کے بعد پورے نظام کی عمارت زمین پر اس طرح گری کہ بڑے بڑے سورما بچھڑے ہوئے نظر آئے، حالانکہ ایک زمانے میں نیشنلائیزیشن ایک فیشن کے طور پر دنیا میں رائج تھا۔ اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف زبان کھولتا تو اس کو سرمایہ دار کا ایجنٹ اور رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج خود روس کا سربراہ یہ کہہ رہا ہے کہ:

> "کاش: یہ اشتراکیت کے نظریہ کا تجربہ روس کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے ملک میں کر لیا گیا ہوتا۔ تاکہ کم از کم ہم اس کی تباہ کاریوں سے بچ جاتے"

"اشتراکیت" ایک غیر فطری نظام تھا

بہر حال: طبعی طور پر یہ ایک غیر فطری نظام تھا، اس لئے کہ دنیا میں بے شمار معاشرتی مسائل ہیں، صرف ایک معیشت ہی کا مسئلہ نہیں ہے، اب اگر ان مسائل کو منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے بیٹھ جائیں تو یقین کیجئے کبھی حل نہیں ہو سکیں گے، آخر یہ بھی تو ایک معاشرتی مسئلہ کہ ایک مرد کو ایک عورت سے شادی کرنی ہے، اور شادی

کے لئے مرد کو مناسب بیوی در کار ہے اور بیوی کو مناسب شوہر چاہئے، اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ شادی کا نظام لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، طلاقیں ہو رہی ہیں گھر اجڑ رہے ہیں اور دونوں کے درمیان ناچاقیاں پیدا ہو رہی ہیں، لہٰذا اس نظام کو چلانے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ اس نظام کو حکومت کے حوالے کر دیا جائے، اور پلاننگ کے ذریعہ یہ طے کیا جائے کہ کونسا مرد کس عورت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اور کونسی عورت کس مرد کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاننگ کے ذریعہ اگر کوئی شخص اس مسئلے کو حل کرنا چاہے گا تو وہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہو گا، جس سے بہتر نتائج کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

یہی صورت حال اشتراکیت میں پیش آئی، اس میں چونکہ یہ سارے مسائل پلاننگ اور منصوبہ بندی کے حوالے کئے گئے، تو اب سوال یہ ہے کہ پلاننگ کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرے گی اور حکومت کیا چیز ہے؟ وہ چند فرشتوں کے مجموعے کا نام نہیں، بلکہ وہ بھی انسانوں ہی کے اندر سے وجود میں آنے والے گروپ کا نام ہے اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ دار دولت کے بہت بڑے وسائل پر قبضہ کر کے من مانی کرتا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اشتراکیت کے نتیجے میں اگرچہ بہت سارے سرمایہ دار تو ختم ہو گئے، لیکن ایک بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا، جس کا نام بیورو کریسی، افسر شاہی اور نوکر شاہی ہے اور اب سارے وسائل پیداوار اور ساری معیشت اور بیورو کریس (افسر شاہی) کے ہاتھ میں آگئے، لہٰذا اب اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ناانصافی نہیں کریں گے، وہ کون سے آسمان سے اترنے والے فرشتے ہیں، یا وہ کونسا معصومیت کا پروانہ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ یقیناً اس نظام میں بھی خرابیاں ہونگی اور وہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور آپ حضرات نے اس کو دیکھ لیا۔ اور یہ نظام اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آج اس کا نام لینے والے بھی شرما شرما کر اس کا نام لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں

اب اشتراکیت کے فیل ہونے کے بعد آج سرمایہ دار مغربی ممالک بڑے زور و

شور کے ساتھ بغلیں بجا رہے ہیں۔ کہ چونکہ اب اشتراکیت فیل ہو گئی ہے، لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہو گئی، اب انسان کے لئے سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ کوئی نظام کار آمد نہیں ہو سکتا، اور اب یہ بات بالکل طے ہو چکی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کا جو بنیادی فلسفہ ہے وہ یہ کہ آزاد بازار کا وجود، اور لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑنا اگر چہ نظریاتی طور پر ایک معقول فلسفہ ہے، لیکن جب اس فلسفے پر حد سے زیادہ عمل کیا گیا تو اس فلسفہ نے آگے چل کر خود اپنی جڑ کاٹ لی، یہ بات درست ہے کہ جب لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد و طلب کی قوتیں بر سر کار آئیں گی اور وہ ان مسائل کو حل کر دیں گی، لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ رسد و طلب کی یہ قوتیں اس قوت تک کار آمد ہوتی ہیں جب بازار میں مسابقت کی فضا ہو، اور آزاد مقابلہ ہو، اور اجارہ داری نہ ہو۔

مثلاً میں بازار سے ایک چھتری خریدنا چاہتا ہوں۔ اور بازار میں بہت سے لوگ چھتری بیچنے والے موجود ہیں، جو مختلف قیمتوں پر چھتری بیچ رہے ہیں، ایک دکاندار =/۵۰۰ روپے میں بیچ رہا ہے۔ اور دوسرا دکاندار =/۴۵۰ روپے کی بیچ رہا ہے۔ اب مجھے اختیار ہے کہ چاہے وہ چھتری /۵۰۰ روپے کی خریدوں یا =/۴۵۰ روپے کی خریدوں، اس صورت میں تو رسد اور طلب کی قوتیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں، اور ان کا صحیح عمل ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر بازار میں چھتری بیچنے والا صرف ایک دکاندار ہے، اور میرے پاس کوئی چوائس اور انتخاب نہیں ہے۔ اگر مجھے چھتری خریدنی ہے تو اسی سے خریدنی ہوگی، تو اب وہ اپنی من مانی قیمت میں چھتری بیچے گا، اور اس کے اندر مجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا، اور اب رسد و طلب کی قوتیں یہاں ختم ہو گئیں۔ اس لئے اب تو صرف یک طرفہ قیمت کا تعین ہے۔ جو اس اجارہ دار نے مقرر کر دیا، اور مجھے کوئی اختیار نہیں رہا۔

لہٰذا یہ رسد اور طلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں آزاد مقابلہ ہو، اور اگر اجارہ داری ہو تو وہاں یہ قوتیں کام نہیں دیتیں

پھر جب انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا کہ جو طریقہ تم اختیار کرنا چاہو، اختیار کر لو، تو اس نے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے، جس کے ذریعہ بازار میں اجارہ داری قائم ہو گئی، اور دوسری طرف سرمایہ داری نظام میں انسان کو

سود کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، قمار کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، سٹے کے ذریعہ نفع کمانا جائز، اور ان تمام طریقوں سے بھی نفع کمانا جائز ہے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، جو طریقہ چاہے اختیار کرے، انسان کو اس کی بالکل کھلی اجازت ہے، اور اس کی کھلی چھوٹ کی وجہ سے بسا اوقات اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں رسد و طلب کی قوتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ عملی طور پر وجود میں نہیں آتا۔

منافع کمانے کے لئے بالکل آزادی دینے کے نتیجے میں دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ کوئی اخلاقی قدر ایسی باقی نہیں رہی جو اس بات کا خیال کرے کہ معاشرے کو کونسی چیز مفید ہوگی۔ اور کونسی چیز مضر ہوگی، ابھی چند روز پہلے امریکی رسالے ٹائم میں، میں نے پڑھا کہ ایک موڈل گرل مصنوعات کے اشتہار پر اپنی تصویر دینے کے لئے ایک دن میں ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہے اب سوال یہ ہے کہ وہ تاجر اور کارخانہ دار یہ ۲۵ ملین ڈالر کہاں سے حاصل کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ غریب عوام سے وصول کرے گا، اس لئے کہ جب وہ چیز اور وہ پیداوار بازار میں آئے گی تو یہ ۲۵ ملین ڈالر اس کی لاگت اور کوسٹ میں شامل ہو کر میری اور آپ کی جیب سے وصول کریں گے۔

یہ فائیو اسٹار ہوٹل جن میں ایک دن کا کرایہ ۲۵۰۰ روپے یا =/۳۰۰۰ روپے ہے۔ ایک متوسط درجے کا آدمی ان ہوٹلوں کی طرف رخ کرتے ہوئے ڈرتا ہے، لیکن وہ تمام فائیو اسٹار ہوٹل ان غریب عوام کی آمدنیوں سے وجود میں آئے۔ کہ آپ یہ دیکھیں ان ہوٹلوں میں کون جاکر ٹھیرتا ہے؟ یا تو سرکاری ملازمین اور سرکاری افسران گورنمنٹ کے اخراجات پر ٹھیرتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ ان کا خرچہ گورنمنٹ ادا کرتی ہے، اور گورنمنٹ کا مطلب ہے ٹیکس ادا کرنے والوں کا روپیہ، اور یا پھر دوسرا طبقہ ان ہوٹلوں میں آکر ٹھیرتا ہے وہ تاجر، صنعتکار ہوتے ہیں۔ جو اپنے تجارت کے سفروں کے دوران ان ہوٹلوں میں ٹھیرتے ہیں۔ لیکن وہ ان ہوٹلوں کا خرچہ کہاں سے وصول ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ دار اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتے۔ بلکہ درحقیقت وہ اخراجات اس چیز کی لاگت (Cost) میں شامل ہونگے۔ جو چیز وہ بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ اور اس کی لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت میں اضافہ کریں گے، اور پھر وہ قیمت

عوام سے وصول کی جائیگی۔

لہٰذا کوئی اخلاقی قدر اور کوئی اخلاقی پیمانہ اس بات کا موجود نہیں ہے کہ منافع کمانے کا کونسا طریقہ درست اور معاشرے کے لئے مفید ہے۔ اور کونسا طریقہ معاشرے کے لئے مضر اور مہلک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بد اخلاقیاں، ناانصافیاں اور مظالم وجود میں آرہے ہیں۔

اسلام کے معاشی احکام

اب میں اسلام کی معاشی تعلیمات کی طرف آتا ہوں، تاکہ مندرجہ بالا پس منظر میں اس کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے یہ فلسفہ کہ معاشی مسائل کا تصفیہ پلاننگ کے بجائے مارکیٹ کی قوتوں کے تحت ہونا چاہئے، اس بنیادی فلسفہ کو اسلام تسلیم کرتا ہے، قرآن کریم کہتا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا

(الزخرف. ۳۲)

یعنی ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے، اور ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت عطا کی ہے۔ اور اس کے بعد کتنا خوب صورت جملہ ارشاد فرمایا کہ " لیتخذ بعضهم بعضاً سخرياً " تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معیشت تقسیم کی ہے، یعنی وسائل کی تقسیم، اور قیمتوں کا تعین، اور تقسیم دولت کے اصول یہ سارے کے سارے کسی انسانی پلاننگ کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بازار اور اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ معیشت خود بخود تقسیم ہو جائے۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے تقسیم کیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آکر خود دولت تقسیم فرمادی کہ اتنا تم لے لو، اور اتنا تم لے لو، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قوانین بنا دیئے ہیں، جن کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہو جائے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ درجے کا معاشی اصول یہ بیان فرمایا کہ:

دعوا الناس یرزق اللہ بعضہم من بعض

(صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للبادی۔ حدیث نمبر ۱۵۲۲)

یعنی لوگوں کو آزاد چھوڑ دو، کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرماتے ہیں۔ یعنی ان پر بلاوجہ پابندیاں نہ لگاؤ۔ بلکہ آزاد چھوڑو، اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا عجیب و غریب نظام بنایا ہے مثلاً میرے دل میں اس وقت یہ خیال آیا کہ بازار جاکر "لیچی" خریدوں، اور بازار میں جو شخص پھل بیچنے والا ہے اس کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم جاکر "لیچی" فروخت کرو، اور اب جب میں بازار گیا تو دیکھا کہ ایک شخص "لیچی" بیچ رہا ہے، اس کے پاس گیا اور اس سے بھاؤ تاؤ کر کے اس سے "لیچی" لے لی، اور اس کو پیسے دے دیئے، تو یہ مطلب اس حدیث کا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا فرماتے ہیں۔

بہر حال یہ بنیادی اصول کہ مارکیٹ کی قوتیں ان بنیادی مسائل کا تعین کرتی ہیں، یہ اصول تو اسلام کو تسلیم ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بنیادی امتیاز کہ معیشت کو مارکیٹ کی قوتوں پر بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسانوں کو منافع کمانے کے لئے اتنا آزاد نہ چھوڑو کہ ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی کو سلب کر لے۔ یعنی ایک کو اتنا آزاد چھوڑا کہ وہ اجارہ دار بن گیا۔ اور بازار میں اس کی اجارہ داری قائم ہو گئی، اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی، لہٰذا اسلام نے اس آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں وہ پابندیاں کیا ہیں؟ ان کو میں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ نمبر ایک شرعی اور الٰہی پابندی، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ تم اپنا منافع تو کماؤ، لیکن تمہیں فلاں کام نہیں کرنا، اس کو دینی پابندی بھی کہتے ہیں دوسری قسم ہے "اخلاقی پابندی"، "تیسری قسم" قانونی پابندی" ہے۔ یہ تین قسم کی پابندیاں ہیں جو انسان پر شریعت نے عائد کی ہیں۔

۱۔ دینی پابندی

پہلی قسم کی پابندی جو "دینی پابندی" ہے یہ بہت اہمیت کی حامل ہے، جو اسلام کو دوسرے معاشی نظریات سے ممتاز کرتی ہے، اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام اب اپنے بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اتنا نیچے آگیا ہے کہ اب اس میں حکومت کی کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی ہے، لیکن حکومت کی یہ مداخلت ذاتی عقل اور سیکولر تصورات کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور اسلام جو پابندی عائد کرتا ہے، وہ "دینی پابندی" ہوتی ہے، وہ دینی پابندیاں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم بازار میں منافع کماؤ، لیکن تمہارے لئے سود کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں، اگر ایسا کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے، اسی طرح "قمار" کو ممنوع قرار دے دیا، "قمار" کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں، اور احتکار" ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دے یا "سٹہ" کو ممنوع قرار دے دیا، ویسے تو شریعت نے یہ کہہ دیا ہے کہ جب دو آدمی اگر کوئی معاملہ کرنے پر راضی ہو جائیں، تو پھر وہ قانونی معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ دونوں اگر کسی ایسے معاملہ پر راضی ہو جائیں جو معاشرے کی تباہی کا سبب ہو، اس معاملے کی اجازت نہیں، مثلاً "سود" کے معاملے پر دو آدمی رضامندی سے معاملہ کر لیں، تو چونکہ "سود" کے ذریعہ معاشی طور پر نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے شرعاً اس کی اجازت نہیں، اب "سود" کے ذریعہ معاشی طور پر کیا تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، لیکن میں آپ کے سامنے ایک سادہ سی مثال پیش کرتا ہوں، جس سے ان تباہ کاریوں کا ذرا سا اشارہ ہو جائیگا۔

سودی نظام کی خرابی

سود کے نظریئے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک شخص کی آمدنی یقینی اور دوسرے کی آمدنی خطرے میں ہے اور غیر یقینی ہے، مثلاً ایک شخص نے کسی سے سود پر قرض لیا۔ تو اب اس نے جس سے قرض لیا اس کو تو ایک متعین رقم بطور سود کے ضرور ادا کرنی ہے،

اور جس نے قرض لیا ہے وہ اس قرض کی رقم سے جب کاروبار کرے گا تو ہو سکتا ہے تو اس کی کاروبار میں نفع ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس کو کاروبار میں نقصان ہو جائے۔ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں، اور اب جس صورت میں قرض لینے والا نقصان میں رہا، اس صورت میں بھی ۱۶/ فیصد قرض دینے والے بنک یا ادارے کو ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری اور لازم ہے، لہٰذا قرض لینے والا نقصان میں رہا۔ اور بعض مرتبہ اس کے برعکس قرض دینے والا نقصان میں ہوتا ہے، اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بنک سے سود پر دس کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس سے کاروبار شروع کیا، بہت سی تجارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں سو فیصد بھی نفع ہوتا ہے۔ فرض کریں کہ اس شخص کو دس کروڑ پر پچاس فیصد نفع ہوا اب وہ بنک کو صرف سود کی متعین شرح مثلاً ۱۵٪ اس نفع میں سے بنک کو ادا کرے گا اور باقی پورا ۳۵ فیصد خود اس کی جیب میں چلا گیا، اب یہ دیکھئے کہ جو اس نے تجارت کی وہ پیسہ کس کا تھا؟ وہ تو عوام کا تھا، اور اس کے ذریعہ جو نفع کمایا گیا، اس کا ۳۵٪ نفع صرف ایک شخص کی جیب میں چلا گیا جس نے تجارت کی اور صرف ۱۵ فیصد بنک کے پاس پہنچا اور پھر بنک نے اس میں سے اپنا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ تھوڑا سا حصہ مثلاً دس فیصد تمام ڈیپازیٹر کے درمیان تقسیم کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے پیسے سے جو ۵۰ فیصد نفع ہوا تھا اس کا صرف دس فیصد عوام میں تقسیم ہوا اور ۳۵ فیصد صرف ایک آدمی کی جیب میں چلا گیا اور عوام وہ دس فیصد لے کر بہت خوش ہے کہ ہم نے بنک میں سو روپے رکھوائے تھے اور اب سال بھر کے بعد ایک سو دس ہو گئے لیکن اس بچارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دس روپے پھر واپس اس سرمایہ دار تاجر کے پاس چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس تاجر نے ۱۵ فیصد بنک کو جو سود کی شکل میں دیا تھا، وہ اس کو اپنی پروڈکشن کی لاگت میں شامل کرے گا اور لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت کا حصہ بن جائے گا اور وہ قیمت پھر عوام سے وصول کرے گا لہٰذا ہر اعتبار سے وہ فائدے میں رہا پھر اس کو نقصان کا بھی خطرہ نہیں اور اگر بالفرض اس کو نقصان ہو بھی جائے تو اس کی تلافی کے لئے انشورنس کمپنیاں موجود ہیں وہ انشورنس کمپنیاں جس میں ان عوام کے پیسے رکھے ہیں جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک وہ انشورنس کی قسط (Premium) ادا نہ کرے، ان عوام کے پیسوں سے اس سرمایہ دار

کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔

بہر حال سودی نظام کے ظالمانہ طریقے کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کر دیا لہٰذا سود کے ذریعہ معیشت میں ناانصافی، ناہمواری پیدا ہونا لازم ہے اس لئے شریعت نے اس کو منع کیا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے فوائد

اب اگر یہی تجارت سود کے بجائے "شرکت" اور "مضاربت" کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں بنک اور سرمایہ لینے والے کے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہو گا کہ یہ بنک کو ۱۵ فیصد ادا کرے گا، بلکہ یہ معاہدہ ہو گا کہ یہ سرمایہ لینے والا جو کچھ نفع کمائے گا اس کا آدھا مثلاً بنک کو ادا کرے گا اور آدھا تجارت کرنے والے کا ہو گا اب اگر پچاس فیصد نفع ہوا ہے تو پچیس فیصد بنک کو ملے گا اور پچیس فیصد اس کو ملے گا اس طرح دولت کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف ہو گا اس لے کہ بنک کے واسطے سے وہ پچیس فیصد ڈیپازیٹر کو ملے گا اس سے معلوم ہوا کہ "سود" کا برا اثر تقسیم دولت پر بھی پڑتا ہے اور اس کے نتائج معیشت کی پشت پر نظر آتے ہیں۔

قمار حرام ہے

اسی طرح اسلام نے "قمار" کو حرام قرار دیا ہے۔ "قمار" کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص نے تو اپنا پیسہ لگا دیا اب دو صورتیں ہوں گی یا تو جو پیسہ اس نے لگایا، وہ بھی ڈوب گیا، یا اپنے ساتھ بہت بڑی دولت لے آیا، اس کو "قمار" کہتے ہیں۔ اس کی بے شمار شکلیں ہیں عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس مغربی نظام زندگی میں "جوا" (Gambling) کو بہت سی جگہوں پر قانون کے اندر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جب (Gambling) مہذب شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ جائز ہو جاتی ہے اور خلاف قانون نہیں رہتی مثلاً ایک غریب آدمی سڑک کے کنارے "جوا" کھیل رہا ہے تو پولیس اس کو پکڑ کر لے جائے گی لیکن اگر "جوا" کو مہذب شکل دے دی جائے اور اس کے لئے کوئی

ادارہ قائم کر لیا جائے اور اس کا کوئی دوسرا نام رکھ دیا جائے تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے اس قسم کا "قمار" ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے میں پھیلا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں بے شمار انسانوں سے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک انسان پر اس کی بارش برسا دی جاتی ہے اس لئے یہ "جوا" شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح "احتکار" (Hoarding)یعنی ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے چوں کہ ہر انسان اس کو جانتا ہے اس لئے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

اکتناز جائز نہیں

اسی طرح "اکتناز" یعنی انسان اپنا پیسہ اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھے کہ اس پر جو شرعی فرائض ہیں ان کو ادا نہ کرے مثلاً زکوۃ اور دیگر مالی حقوق ادا نہیں کرتا۔ اس کو شریعت میں اکتناز کہتے ہیں اور شرعاً یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

ایک اور مثال

اور سنئے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"لا يبع حاضر لباد"

(صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم الحاضر للبادی، حدیث نمبر ۱۵۲۲)

کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ یعنی دیہاتی اپنا مال دیہات سے شہر میں بیچنے کے لئے لا رہا ہے اس وقت میں کسی شہری کے لئے جائز نہیں کہ وہ جا کر اس سے کہے کہ میں تمہارا مال فروخت کر دوں گا، بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، اس لئے کہ اس معاملے میں شہری بھی راضی اور دیہاتی بھی راضی لیکن سرکار دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا۔ اس لئے کہ شہری جب دیہاتی کا مال اپنے قبضہ میں کر لے گا تو وہ اس مال کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک کہ بازار میں اس کی قیمت زیادہ نہ ہو جائے اس لئے عام گرانی پیدا کرنے سبب بنے گا، اس کے بر خلاف اگر دیہاتی خود اپنا مال شہر میں لاکر فروخت کرے گا تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنا مال نقصان پر تو فروخت نہیں کرے گا لیکن اس کی خواہش یہ ہوگی کہ جلدی سے اپنا مال فروخت کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں تو اس طرح حقیقی طلب اور حقیقی رسد کے ذریعہ قیمتوں کا تعین ہو جائے گا اور اگر درمیان میں (Middleman) آگیا تو اس کی وجہ سے رسد اور طلب کی قوتوں کو آزادانہ کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور اس (Middleman) کی وجہ سے قیمت بڑھ جائے گی۔

اس لئے وہ تمام ذرائع اور تمام راستے جن کے ذریعہ معاشرے کو گرانی کا شکار ہونا پڑے اور جن کے ذریعہ معاشرے کو ناانصافی کا شکار ہونا پڑے ان پر شرعی اعتبار سے پابندی عائد کی گئی ہے۔ بہر حال یہ پابندیوں کی پہلی قسم ہے جو اس آزاد معیشت پر شرعاً عائد کی گئی ہیں۔

۲۔ اخلاقی پابندی

آزاد معیشت پر شرعاً دوسری پابندی جو عائد کی گئی ہے اس کو "اخلاقی پابندی" کہتے ہیں اس لئے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو شرعاً حرام تو نہیں اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے البتہ ان کی ترغیب ضروری دی ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام ایک معاشی نظام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دین ہے اور ایک نظام زندگی ہے جس میں سب سے پہلے یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ انسان کا بنیادی مقصد آخرت کی بہبود ہے لہٰذا اسلام یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگر تم فلاں کام کرو گے تو آخرت میں تمہیں بہت بڑا اجر ملے گا اسلام ذاتی منافع کا محرک تو ہے لیکن وہ صرف دنیاوی منافع کی حد تک محدود نہیں۔ بلکہ ذاتی منافع میں آخرت کے منافع کو بھی لازماً شامل سمجھتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے بہت سے احکام ہمیں اس بات کے دئے ہیں کہ تمہیں دنیا میں اگر چہ نفع کچھ کم ملے لیکن

آخرت میں اس کا نفع بہت ملے گا مثلاً شرعاً یہ کہا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اپنی معیشت کو کمانے کے لئے بازار میں نکلا ہے اگر یہ نیت کرے کہ وہ اس لئے بازار میں نکلا ہے کہ معاشرے کی فلاں ضرورت کو پورا کروں گا تو اس کی اس نیت کی وجہ سے اس کا یہ سارا عمل عبادت بن جائے گا اور باعث اجر ہو جائے گا اور پھر اس نقطہ نظر سے انسان اس چیز کا انتخاب کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہوگی۔ اور حقیقت میں معاشرے کو دینی اعتبار سے ضرورت ہونی چاہئے۔ مثلاً فرض کریں کہ لوگ اگر رقص و سرور کے زیادہ شائق ہیں تو اس صورت میں کیپٹل ازم کا تصور تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ منافع کمانے کے لئے ناچ گھر قائم کریں چوں کہ طلب اس کی زیادہ ہے، لیکن اسلام کی اس دینی پابندی کے تحت اس کے لئے ناچ گھر قائم کرنا جائز نہیں، یا مثلاً ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں فلاں کارخانہ لگاؤں گا تو اس میں مجھے منافع تو بہت ہوگا۔ لیکن اس وقت چونکہ رہائشی ضرورت کے لئے لوگوں کو مکانات کی ضرورت ہے اور اس میں منافع تو زیادہ نہیں ہوگا لیکن لوگوں کی ضرورت پوری ہوگی تو اس وقت شریعت کی اس اخلاقی پابندی پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت کے منافع کا حق دار ہوگا۔

قانونی پابندی

تیسری پابندی "قانونی پابندی" ہے یعنی اسلام نے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ جس مرحلے پر حکومت یہ محسوس کرے کہ معاشرے کو کسی خاص سمت پر ڈالنے کے لئے کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہے تو ایسے وقت میں حکومت کوئی حکم جاری کر سکتی ہے، اور پھر وہ حکم تمام انسانوں کے لئے قابل احترام ہے چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ"

(سورۃ النساء ۵۹)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی اہل ریاست کی بھی اطاعت کرو اسی لئے فقہاء کرام نے فرمایا کہ اگر حاکم وقت جو صحیح معنی میں اسلامی حکومت کا سربراہ ہو اگر کسی مصلحت کی بنیاد پر یہ حکم دے دے کہ فلاں دن تمام لوگ روزہ رکھیں تو اس دن روزہ رکھنا پوری رعایا پر عملاً واجب ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھے گا تو عملی طور پر اس کو ایسا ہی گناہ ہو گا جیسے رمضان کا روزہ چھوڑنے کا گناہ ہوتا ہے اس لئے کہ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔

(دیکھیں شامی ج ۴ ص ۲۶۴، روح المعانی، ج ۵، ص ۶۶)

اسی طرح فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر اولی الامر یہ حکم جاری کر دے کہ لوگوں کے لئے خربوزہ کھانا منع ہے تو اب رعایا کے لئے خربوزہ کھانا حرام ہو جائے گا بہر حال اولی الامر کو ان چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ یہ احکام عام لوگوں کی مصلحت کے تحت جاری کرے اب اس میں جزوی منصوبہ بندی بھی داخل ہے مثلاً حکومت یہ کہہ دے کہ فلاں چیز میں لوگ سرمایہ کاری کریں اور فلاں چیز میں سرمایہ کاری نہ کریں تو حکومت حدود شرعیہ میں قانونی طور پر اس قسم کی پابندی عائد کر سکتی ہے۔

بہر حال کیپیٹل ازم کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام میں یہ بنیادی امتیاز اور فرق ہے اور یاد رکھئے کہ جہاں تک قانونی پابندی کا تعلق ہے یہ پابندی کیپیٹل ازم میں بھی پائی جاتی ہے لیکن یہ پابندیاں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور اسلام میں اصل امتیاز دینی پابندیوں کا ہے جو "وحی" کے ذریعے مستفاد ہوتی ہیں، اور جس میں اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ فلاں چیز تمہارے لئے مضر ہے اور منع ہے در حقیقت یہ چیز ایسی ہے کہ جب تک انسانیت اس راستے پر نہیں آئے گی اس وقت تک انسانیت افراط و تفریط کا شکار رہے گی۔

بیشک اشتراکیت میدان میں شکست کھا گئی۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جو خرابیاں تھیں یا اس کی جو ناانصافیاں اور ناہمواریاں تھیں۔ کیا وہ ختم ہو گئیں؟ وہ یقیناً آج بھی اسی طرح برقرار ہیں اور ان کا حل اگر ہے تو وہ ان الٰہی پابندیوں میں ہے، اور ان الٰہی پابندیوں کی طرف آئے بغیر انسان کو سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ بس ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ابھی تک ان "الٰہی پابندیوں" پر مبنی معیشت کا کوئی عملی ڈھانچہ اور عملی نمونہ دنیا کے

سامنے پیش نہیں کر سکے اور ہمارے ملک پاکستان کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ ان معاشی تعلیمات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دکھائے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ حقیقت میں اسلامی معیشت کن بنیادی خصوصیات کی حامل ہے اور کس طرح ان کو اپنایا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے استحقاق سے زیادہ آپ حضرات کا وقت لے لیا اور اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک خشک موضوع کے اندر میں نے آپ کو مشغول رکھا، اور میں آپ حضرات کے حسن سماعت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے صبر و ضبط اور تحمل کے ساتھ اس گفتگو کو سنا، اللہ تعالیٰ اس کو میرے لئے بھی اور سننے والوں کے لئے مفید بنائے اور اس کی بہتر نتائج پیدا کرے آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دولت قرآن کی قدر و عظمت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی
ضبط و ترتیب :مولانا صبار دانش صاحب حیدر آبادی
تاریخ و وقت :۵؍ شعبان ۱۴۰۷ھ ـــ ۲۳؍ مارچ ۱۹۸۸ء رات ساڑھے دس بجے
مقام : مدرسہ اشرف العلوم۔ لیاقت کالونی۔ حیدر آباد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دولت قرآن کی قدر و عظمت

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و اشھد ان سیدنا و سندنا وشفیعنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ و بارک وسلم تسلیمًا کثیرًا۔

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔

اٰمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم۔ ونحن علیٰ ذالک من الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین۔

حضرت علماء کرام، بزرگان محترم اور برادران عزیز! اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان و کرم ہے کہ آج ایک ایسی مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جو قرآن کریم کی تعلیم کے اختتام سال پر منعقد ہوئی اور اس موقع پر کئی بچوں نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے اس قرآن کریم کی درس و تدریس کی تکمیل کے موقعہ پر شریک ہونا ہر مسلمان کے لئے باعث سعادت عظمیٰ ہے، اللہ تعالیٰ مجھے، آپ کو اور سب کو قرآن کریم کی اس برکت میں حصہ دار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نعمت و دولت قرآن کی قدر

حقیقت یہ ہے کہ آج ہم لوگوں کو قرآن کریم کی اس نعمت اور دولت کی قدر معلوم نہیں، بچے قرآن کریم پڑھتے ہیں، حفظ کرتے ہیں اور الحمد للہ حسب توفیق ہم اس پر خوشی منا لیتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس قرآن کریم کی دولت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہمیں آپ کو اس دنیا میں رہتے ہوئے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ قرآن کی دولت ہمیں گھر بیٹھے چھپر پھاڑ کر عطا کر دی۔ ہمیں اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے اس نعمت کے حصول کے لئے، کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑی ہم نے کوئی محنت نہیں اٹھائی۔ کوئی قربانی نہیں دی، کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا، کوئی جان و مال کی قربانی اس راہ میں پیش نہیں کی، اس واسطے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہمیں آپ کو نہیں، اس دولت قرآن کریم کی قدر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے پوچھئے، جنہوں نے ایک ایک آیت کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی، مال کی، آبرو کی، خاندان کی، جذبات کی ایسی قربانیاں دیں کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

قرآن کریم اور صحابہ کرامؓ

قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو سیکھنے کے لئے صحابہ کرام، نے جو دشواریاں اٹھائی ہیں، جو محنتیں اٹھائی ہیں، ان کا حال آج ہمیں معلوم نہیں، قرآن ہمارے سامنے ایک نہایت خوشنما مجلد کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ مدرسہ کھلا ہوا ہے۔ استاد پڑھانے کے لئے موجود ہے اور ہمارا کام صرف یہ ہے کہ نوالہ بنا کر منہ میں لے جائیں اور حلق سے اتار دیں، لیکن وہ بھی صحیح معنوں میں جس طرح اتارنا چاہئے اس طرح نہیں اترتا۔

قرآن کریم کی قدر ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے پوچھئے جنہوں نے ایک ایک چھوٹی چھوٹی آیت کے خاطر ماریں کھائی ہیں، کفار کے ظلم و ستم برداشت کئے ہیں۔ اور کس کس طرح اس قرآن کریم کا علم حاصل کیا ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ آتا ہے، ایک صحابیؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چھوٹے بچے تھے، اور مدینہ طیبہ سے بہت فاصلہ پر ایک بستی میں رہتے تھے، مدینہ طیبہ آنا جانا ممکن نہ تھا۔ مسلمان ہو چکے تھے، لیکن نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جاکر علم حاصل کرنا، ان کی اپنی ذاتی مجبوری کی وجہ سے مشکل تھا۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں یہ کیا کرتا تھا کہ روزانہ اس سڑک پر چلا جاتا جہاں سے مدینہ طیبہ کے قافلے آیا کرتے تھے۔ جو کوئی قافلہ آتا تو ان سے پوچھتا کہ بھائی اگر آپ لوگ مدینہ طیبہ سے آرہے ہیں تو کیا آپ لوگوں میں سے کسی کو قرآن کریم کی کوئی آیت یاد ہے؟ اگر کسی کو قرآن کریم کی کوئی آیت یاد ہو تو مجھے سکھا دیجئے، قافلہ میں کسی کو ایک آیت یاد ہوتی، کسی کو دو آیتیں یاد ہوتیں، کسی کو تین آیتیں یاد ہوتیں، اس طرح ان قافلے والوں سے سن سن کر، اور ان کے پاس جا جا کر میں نے ایک ایک دو دو آیتیں حاصل کیں اور الحمدللہ اس طرح میرے پاس قرآن کریم کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو گیا۔

ان سے اس قرآن کی قدر پوچھئے، جن کو ایک ایک آیت حاصل کرنے کے لئے قافلے والوں کی منت سماجت کرنی پڑ رہی ہے، لیکن ہمارے پاس پورا قرآن تیار شکل میں موجود ہے۔ جن اللہ کے بندوں نے اسے ہم تک پہنچایا، جن محنتوں، قربانیوں اور مشکلات سے گزر کر اس کو ہمارے لئے تیار کر کے چھوڑ گئے۔ ہمارا کام صرف اتنا رہ گیا ہے کہ اس کو پڑھ لیں، پڑھنا سیکھ لیں اس کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر عمل کریں، گویا پکی پکائی روٹی تیار ہے صرف کھانے کی دیر ہے، اس واسطے قدر نہیں معلوم ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بہنوئی اور بہن کا واقعہ ہے (اس واقعہ کو ہر مسلمان جانتا ہے) وہ دونوں جانتے تھے اگر ہم یہ قرآن حضرت عمرؓ کے سامنے بیٹھ کر پڑھیں گے (اس وقت تک حضرت عمر مسلمان نہیں ہوئے تھے) تو وہ ہمیں پڑھنے نہیں دیں گے، بلکہ ہمیں سزا دیں گے اس واسطے چھپ چھپ کر پڑھتے، ایک روز حضرت عمرؓ حضور کے قتل کے ارادے سے جارہے تھے کسی نے کہا کہ دوسروں کو تو اسلام سے روکتے ہیں، اپنے گھر کی جاکر خبر نہیں لیتے، وہاں پر کیا ہو رہا ہے، واپس آکر دیکھا کہ بہن اور بہنوئی قرآن کریم کھولے ہوئے بیٹھے ہیں اور وہ اس وقت سورہ طٰہٰ کی تلاوت کر رہے تھے (لمبا واقعہ ہے جو آپ حضرات کو معلوم ہے)

بہر حال ان مشکلات کے دور میں ایک ایک آیت صحابہ کرامؓ نے اس طرح حاصل کی ہے۔ اس لئے وہ اس کی قدر و قیمت پہنچانتے تھے، چونکہ ہم اور آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ دولت مل گئی ہے اس لئے اس کی قدر نہیں پہنچانتے، جب تک یہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، جب تک یہ دنیا کا نظام چل رہا ہے، جب تک موت نہیں آتی۔ اس وقت تک ذہن دنیا کی ظاہری چمک دمک میں، اور دوسری چیزوں میں لگا ہوا ہے۔ ایک وقت آنا ہے جب دنیا سے جانا ہے جب انسان قبر کے اندر پہنچے گا، وہاں اس قرآن کریم کی دولت اور عظمت کا پتہ چلے گا، وہاں جاکر اس نعمت کا پتہ

چلے گا، ایک ایک آیت پر کیا کچھ انوار، کیا کچھ نعمتیں اور کیا کچھ انعامات ملیں گے۔

قرآن کریم کی تلاوت کا اجر

ایک حدیث شریف میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص قرآن کریم پڑھتا ہے۔ تو اس کو ایک ایک حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ پھر تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، م ایک حرف، تو جب الم پڑھا تو اس الم کے پڑھنے سے نامہ اعمال میں تیس نیکیوں کا اضافہ ہو گیا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو بغیر سمجھے، پڑھنے سے کیا حاصل؟ یہ تو ایک نسخہ ہدایت ہے، اس کو سمجھ کر انسان پڑھے، اور اس پر عمل کرے تو اس کا فائدہ حاصل ہو گا، محض طوطے مینا کی طرح اس کو رٹ لیا، اس سے فائدہ کیا؟ تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ یہ قرآن ایسا نسخہ شفا ہے کہ جو شخص اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرے۔ اس کے لئے تو باعث شفا ہے ہی، لیکن اگر کوئی شخص محض اس کی تلاوت کیا کرے، بغیر سمجھے بھی تو اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی نیکیاں لکھی ہیں کہ ایک الم کے پڑھنے پر تیس نیکیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم سے غفلت کا باعث

ان نیکیوں کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کشش پیدا نہ ہوئی، کوئی جنبش نہ ہوئی، کوئی حرکت نہیں ہوئی کوئی جذبہ دل میں پیدا نہ ہوا۔ کیوں؟ اس واسطے کہ آج کی دنیا کا سکہ نیکیاں نہیں، یہ جو کہا جا رہا ہے کہ نیکیوں میں اضافہ ہو جائے گا نامہ اعمال میں اضافہ ہو جائے گا یہ سکہ رائج الوقت نہیں، اگر یوں کہا جاتا کہ الم کے الف، پر دس روپے ملیں گے، لام پر دس روپے ملیں گے، میم پر دس روپے ملیں

گے یعنی الم پڑھنے پر تیس روپے ملیں گے، تو دل اس کی طرف کھنچتا، کشش ہوتی۔ لوگ دوڑتے اور بھاگتے۔ یہاں تو بہت سستا سودا مل رہا ہے کہ الم پڑھو اور تیس روپے کماؤ۔ لیکن چونکہ یہ کہا جارہا ہے کہ روپوں کے بجائے نیکیاں ملیں گی۔ کوئی کشش کوئی جنبش کوئی حرکت دل میں پیدا نہیں ہورہی۔ اس واسطے کہ نیکیوں کی قدر نہیں معلوم، جانتے نہیں کہ نیکی کے بڑھنے سے کیا ہوتا ہے اور روپے کی قدر معلوم ہے، دس روپے ملیں گے تو ان سے اتنا کام ہوگا۔ اور تیس روپے ملیں گے تو اتنا کام ہوگا اس واسطے ان کی قدر وقیمت کا پتہ ہے، نیکیاں بڑھنے سے کون سی کلر ہاتھ آگئی، کونسا بنگلہ بن گیا، کونسے بینک بیلنس میں اضافہ ہوگیا، نیکیاں بڑھ گئیں تو کیا ہوگیا، سکہ رائج الوقت تو ہے نہیں، اس واسطے اس کی طرف کشش نہیں ہوتی۔ اس کی طرف دل میں حرکت نہیں ہوتی۔

جس روز یہ آنکھ بند ہوگئی، جس روز اس قلب کی حرکت رک جائے گی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور حاضری ہوگئی اس دن پتہ چلے گا کہ یہ نیکیاں کیا چیز تھیں اور یہ روپے جس کی ہم قدر کیا کرتے تھے جو آج بڑی قیمتی چیز ہیں یہ کیا تھے؟

در حقیقت مفلس کون ہے؟

حدیث میں آتا ہے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا۔ کہ یہ بتاؤ، مفلس کسے کہتے ہیں؟ مفلس کے معنی کیا ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! مفلس تو اس کو کہتے ہیں جس کے پاس دینار و درہم نہ ہوں یعنی جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ اس زمانے میں درہم چلتے تھے اشرفیاں سونے کی اور درہم چاندی کے، تو جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، دولت نہ ہو وہ مفلس ہے حضور نے فرمایا وہ حقیقی مفلس نہیں۔ حقیقی مفلس کون ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں حقیقی مفلس وہ ہے کہ جب ت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ کی

بارگاہ میں حاضر ہوا تو نیکیوں سے اس کا میزانِ عمل کا پلہ بھرا ہوا تھا، بہت سی نیکیاں لے کر آیا تھا، نمازیں پڑھی تھیں، روزے رکھے تھے، تسبیحات پڑھی تھیں. اللہ کا ذکر کیا تھا، تعلیم کی تھی، تبلیغ کی تھی، دین کی خدمات انجام دی تھی، بہت ساری نیکیاں اللہ تبارک و تعالیٰ کے دربار میں لے کر آیا تھا۔

لیکن جب نیکیاں پیش ہوئیں تو معلوم ہوا کہ نیکی تو بہت کی تھیں نماز بھی پڑھی، روزہ بھی رکھا، زکوٰۃ بھی دی، حج بھی کیا، سب کچھ کیا۔ لیکن بندوں کے حقوق ادا نہ کئے کسی کو ملا، کسی کو برا کہا۔ کسی کا دل دکھایا، کسی کو تکلیف پہنچائی۔ کسی کی غیبت کی، کسی کی جان پر حملہ آور ہوا۔ کسی کا مال کھایا ـــــ کسی کی آبرو پر حملہ کیا۔ یہ اللہ کے بندوں کے حقوق ضائع کئے، نمازیں پڑھی تھیں، روزے رکھے تھے عبادتیں کی تھیں، قرآن کریم کی تلاوت کی تھی سب کچھ کیا تھا۔ لیکن لوگوں کو اپنے ہاتھ سے اپنی زبان سے اور مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچائی تھی، اب جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ وہاں تو عدل ہے انصاف ہے۔ اس لئے جن کے حق مارے تھے ان سے کہا گیا کہ تم اس سے اپنا حق وصول کرو۔ کس کا پیسہ کھایا تھا اس سے پیسے وصول کرو۔ اب وہاں کوئی پیسے تو ہیں نہیں۔ نہ روپیہ نہ پیسہ نہ دولت وہاں دنیا کی سب کرنسیاں ختم ہو چکیں وہ حق کیسے ادا کرے؟

باری تعالیٰ فرمائیں گے یہاں کا سکہ روپیہ پیسہ نہیں، یہاں سکہ تو نیکیاں ہیں۔ وہ نیک اعمال ہیں جو اس نے دنیا کے اندر کئے تھے، لہٰذا اسی کے ذریعہ تبادلہ ہو گا، چنانچہ جس کے پیسے کھائے تھے اس سے کہا جائے گا اس کی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں سے لیلو، اس نے بہت ساری نفلی نمازیں پڑھی تھیں وہ سب ایک صاحب حق کو مل گئیں، دوسری نمازیں دوسرا صاحب حق لے گیا روزے تیسرا صاحب حق لے گیا، حج چوتھا صاحب حق لے گیا اور جتنے نیک اعمال کئے تھے ایک ایک کر کے لوگ لے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ساری نیکیاں ختم ہو جائیں گی، وہ

جتنا ڈھیر لے کر آیا تھا کہ وہ سارا کا سارا ختم ہو گیا۔ اب کچھ باقی نہیں، کچھ لوگ پھر بھی کھڑے ہیں کہ پروردگا ہمارا حق تورہ گیا ہے ہمارے بھی پیسے کھائے تھے۔ ہمیں بھی برا بھلا کہا تھا، ہماری بھی غیبت کی تھی، اس سے ہمارا بھی بدلا دلوایئے۔

لیکن اس کے پاس نیکیوں کا ذخیرہ تو ختم ہو گیا۔ بدلہ کیسے دلوائیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب راستہ یہ ہے کہ تمہارے جو گناہ ہیں وہ تمہارے نامہ اعمال سے مٹا کر اس کے نامہ اعمال میں ڈالدیئے جائیں، تم نے غیبت کی تھی تمہارے سے وہ گناہ معاف، وہ گناہ اس کو دے دیا جائے۔ تم نے کوئی اور ناجائز کام کیا تھا، اس ناجائز کام کا گناہ تمہارے نامہ اعمال سے مٹا کر اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جائے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیکیوں کا ڈھیر لے کر آیا تھا لیکن بندوں کے حقوق کا معاملہ ہوا تو بجائے اس کے لئے کہ وہ نیکیاں باقی رہتیں اور لوگوں کے گناہ بھی اس کے گردن پر ڈالدیئے گئے، فرمایا حقیقت میں مفلس وہ ہے جو نیکیاں لے کر آیا تھا اور گناہوں کا بوجھ لے کر جارہا ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت

اس لئے یہ حقوق العباد بڑے ڈرنے کی چیز ہے، لوگوں کے حقوق مارنا خواہ پیسے کی شکل میں ہو یا عزت کی شکل میں ہو، یا جان کی شکل میں ہو، یہ اتنا خطر ناک معاملہ ہے، کہ اور گناہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے۔

اگر کوئی شخص شراب پیئے معاذ اللہ، زنا کرے، جوا کھیلے، کوئی اور گناہ کرے اور کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کئے ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر سچے دل سے توبہ کرے، اور استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ پڑھ لے تو

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں التائب من الذنب کمن لاذنب لہ۔ جو ایک مرتبہ گناہ سے تائب ہو جائے تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں، سب معاف فرما دیتے ہیں۔

لیکن اگر بندوں کے حقوق مارے، مثلاً ایک پیسہ بھی کسی کا ناجائز کھالیا۔ کسی کو برا بھلا کہہ دیا۔ کسی کا دل دکھا دیا، یہ ایسا گناہ ہے۔ اس کی معافی کی کوئی شکل نہیں۔ یہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ جب تک وہ وہ صاحب حق معاف نہ کرے، جس کا حق سلب کیا ہے، اس واسطے اس معاملہ میں بہت ہی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

ابھی مدرسہ دیکھنے کے لئے بالائی حصہ پر جاناہ ہوا۔ بڑا دل خوش ہوا اللہ تبارک وتعالیٰ اس مدرسہ کو ظاہری وباطنی ہر طرح کی ترقیات عطا فرمائے، یہاں پر دین کے سچے طالب پیدا فرمائے۔ ماشاء اللہ بڑا کام ہو رہا ہے، لیکن جب اوپر بیٹھا تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی تیز کان میں آرہی تھی، باہر بھی، اوپر بھی کہ چاروں طرف اس کا شور مچ رہا تھا، میں نے گذارش کی کہ اس کی آواز ہلکی کرنی چاہئے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی گذارش کی کہ کسی ایک جگہ پر بات چیت سننے کے لئے لوگ جمع ہوں تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ آواز اتنی ہی ہونی چاہئے۔ جتنی کہ حاضرین کہ پہنچانے کے لئے کافی ہو، لیکن سارے محلہ کو سارے شہر کو سنانا کئی وجہ سے جائز نہیں،

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس آواز کی وجہ سے کوئی اللہ کا بندہ کسی گھر میں بیمار ہے اور سونا چاہتا ہے اور اس آواز کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچ رہی ہے اس کی بیماری میں اضافہ ہو رہا ہے یا کوئی اور شخص ہے جو بیمار تو نہیں لیکن سونا چاہتا ہے اور ہماری آواز کی وجہ سے اس کی نیند میں خلل آرہا ہے اس کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ہماری تقریر کی آواز دور دور تک پہنچ رہی ہے قیامت کے دن پوچھا ہو گئی کہ میرا ایک بندہ تمہاری وجہ سے تکلیف میں تھا بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

مسلمان کون ہے؟

حدیث میں نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور ہاتھ سے دوسرے تمام مسلمان محفوظ رہیں، اس کے ہاتھ سے بھی دوسرے مسلمان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس کی زبان سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ ہم تو اپنے زعم میں دین کی بات کر رہے ہیں لیکن دین کی بات کرنے کا بھی شریعت نے طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص آپ کی بات سننا نہیں چاہتا، آپ اس کے کان کے اوپر لاؤڈ اسپیکر لگا کر زبردستی اس کو بات سنائیں، اس کا شریعت میں کوئی جواز نہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، دیکھا کہ ایک صاحب وعظ کہہ رہے ہیں اور لوگ جمع ہیں، لوگ تھوڑے سے ہیں لیکن واعظ آواز بہت تیز نکال رہے ہیں، جو باہر دور تک جارہی ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ اے واعظ! اتنی آواز نکالو، جتنے تمہارے سننے والے موجود ہوں، اس سے باہر تمہاری آواز نہیں جانی چاہئے اور اگر آئندہ تمہاری آواز باہر جائے گی تو سمجھ لو میں اپنا درہ کام میں لاؤں گا۔ اس واسطے کہ باہر کے لوگ سننے والے نہیں ہیں جن کو سننا ہی ہے وہ آپ کے پاس آکر بیٹھ جائیں۔ اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر کا تو رواج ہی نہیں تھا ویسے ہی آواز باہر جارہی تھی، تب بھی فاروق اعظمؓ نے روکا، اگر اس زمانے میں فاروق اعظم ہوتے تو نہ جانے ہم میں سے کتنوں کے کمر پر فاروق اعظمؓ کا درہ ہوتا، کہ دن رات جہاں دیکھو دین کے نام پر ہم وہ کام کرتے ہیں جو دین کے خلاف ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مسجد نبوی کے ساتھ تھا۔ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرماہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا معمول تھا کہ وہ

جمعہ کے بعد کچھ آرام کیا کرتی تھیں، وہاں ایک صاحب وعظ کہنے کے لئے تشریف لے آتے تھے اور وہ بڑی بلند آواز سے وعظ کہا کرتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پیغام بھجوایا کہ آپ جب وعظ کریں تو جتنے لوگ جمع ہوں۔ ان کے مطابق آواز نکلا کریں، باہر دور تک آواز نہ پہنچایا کریں، وہ نہیں مانے اور کہنے لگے میں تو دین کا حکم سنا رہا ہوں دین کی تبلیغ کر رہا ہوں صدیقہ عائشہؓ نے حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس شکایت کی اور کہا کہ وہ شخص یہاں آکر وعظ کہتا ہے اور میری نیند میں خلل واقع ہوتا ہے آپ اس کو روکیں۔

تعلیم نبوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ طریقہ سکھایا، آج ہم نے پتہ نہیں کس چیز کا نام دین سمجھ لیا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ سکھایا وہ کیا ہے؟ آپ تہجد کے لئے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور اس وقت بستر سے کس انداز سے اٹھتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے۔ "قام رویداً" آہستہ سے اٹھتے ہیں "وفتح الباب رویداً" دروازہ آہستہ سے کھولتے ہیں، کیوں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اٹھنے سے صدیقہ عائشہؓ کی نیند میں خلل آجائے، وہ صدیقہ عائشہؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم پر آپ کی ایک ایک ادا پر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں، ایک نیند تو کیا، کروڑوں نیندیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر، لیکن تعلیم یہ دے رہے ہیں کہ اپنی عبادت انجام دینی ہے تو اس طرح نہ دو جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔

یہ ہے حقوق العباد، جو نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے۔ آج اگر ہم کوئی دین کی بات کر رہے ہیں تو ساری دنیا کو سنانا ضروری ہے، چاہے کوئی سو رہا ہو، یا مر رہا ہو، یا کوئی بیمار ہو، اس بات کا کوئی لحاظ نہیں، کسی کے

ذہن میں بھی نہیں آتا کہ ہم یہ کوئی گناہ کا کام کر رہے ہیں۔

مسلمان کی عزت و عظمت

کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے، ایسا ہی گناہ ہے، جیسے شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا، چوری کرنا، زنا کرنا، ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کا طواف فرما رہے تھے حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ تھے، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کو خطاب کر کے فرما رہے ہیں، اے اللہ کے گھر! تو کتنی حرمت والا ہے، کتنی عظمت والا ہے، کتنے تقدس والا ہے، کتنا مقدس ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ لیکن ایک چیز ایسی ہے۔ جس کی عظمت، جس کا تقدس تجھ سے بھی زیادہ ہے یہ کعبۃ اللہ سے خطاب کر کے فرمایا، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دم سے میرے کان کھڑے ہو گئے، میں چونکا، کہ وہ کونسی چیز ہے کہ جس کی عزت و حرمت اور جس کی عظمت بیت اللہ سے بھی زیادہ ہے؟ پھر آپ نے فرمایا کہ وہ چیز ہے ایک مسلمان کی جان، اس کا مال اس کی آبرو۔

مسلمان کی جان، مسلمان کا مال اور مسلمان کی آبرو، یہ تین چیزیں ایسی ہیں اے کعبۃ اللہ ان کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے، کیا مطلب؟ کہ اگر کوئی شخص ناجائز طور پر کسی مسلمان کی جان پر حملہ آور ہو اس میں جان سے مارنا، قتل کرنا، زخمی کرنا، نقصان پہنچانا، تکلیف پہنچانا، جسمانی تکلیف کوئی بھی پہنچائی جا۔ وہ سب اس میں داخل ہیں تو کسی مسلمان کی جان یا مال یا آبرو کو نقصان پہنچانا اتنا گناہ ہے کہ جیسے کوئی شخص کعبۃ اللہ کو ڈھا دے، کعبہ کا منہدم کر دینا جتنا بڑا گناہ ہے اتنا ہی کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو پر ناحق حملہ کرنا گناہ ہے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی جان، مال اور آبرو کے بارے میں کتنی تاکید فرمائی ہے، آج خدانہ کرے، خدانہ کرے، کوئی بدبخت یہ جرات کرے کہ بیت اللہ شریف پر معاذ اللہ حملہ آور ہو کر اس کو منہدم کرنے کی کوشش کرے، کیا کوئی مسلمان ایسا ہے جو اس کی تکہ بوٹی چھوڑ دے اگر اس کے قابو میں آگیا۔ تو کبھی اس کی غیرت گوارا نہیں کرے گی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی بیت اللہ پر حملہ آور ہو۔

لیکن صبح سے شام تک کتنے بیت اللہ ڈھائے جارہے ہیں، کتنے کعبے ڈھائے جارہے ہیں مسلمان کی جان جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت والا قرار دیا تھا وہ مکھی اور مچھر سے زیادہ بے حقیقت ہو کر رہ گئی ہے کہ ایک مکھی یا مچھر کو مارا، یا کسی مسلمان کو مارا، اور مارنے کے علاوہ تکلیف پہنچانے کے جتنے راستے ہیں، جن کا میں نے ذکر کیا وہ سب اس کے اندر داخل ہیں، اور ان سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا بڑا گناہ قرار دیا اور اسی وجہ سے آپؐ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا مفلس وہ شخص ہے کہ جو قیامت کے دن نیکیوں کا بڑا ذخیرہ لے کر آئے، لیکن بالآخر اس کے پاس ایک نیکی بھی باقی نہ رہے، دوسروں کے گناہ اس کے نامہ اعمال میں ڈالدیئے گئے۔

دین اسلام کی حقیقت

آج ہم نے چند ظاہری عبادتوں کا نام دین رکھ لیا ہے نماز پڑھی، روزہ رکھا، کچھ زکوۃ دے دی۔ کچھ نہیں بھی دی اور حج کرنے اور عمرہ کرنے کی دولت مل گئی، یہ عبادتیں اپنی جگہ بڑی نعمتیں ہیں، لیکن دین ان میں منحصر نہیں، دین کا جو علم ہے جسے فقہ کہتے ہیں اس کے چار حصہ ہیں ان میں سے ایک حصہ عبادات سے متعلق ہے باقی تین حصے حقوق العباد سے متعلق ہیں، لیکن ہم نے حقوق العباد کو

دین سے بالکل خارج کر لیا ہے۔ کسی کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ میں نے کوئی گناہ کا کام کیا۔ یا کوئی ناجائز کام کیا۔ یا اللہ تبارک و تعالیٰ کو ناراض کرنے والا کام کیا ہے، اگر ایسا ناراض کرنے والا کوئی کام کیا۔ تو اس کی توبہ کی کوئی شکل نہیں جب تک وہ صاحب حق اس کو معاف نہ کر دے۔

رشوتوں کا دور دورہ ہے۔ لوگوں کو ایذا پہنچا رہے ہیں، تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں ان کا حق لوٹا جا رہا ہے، یہ ساری کی ساری باتیں حقوق العباد سے متعلق ہیں، تکلیف پہنچانے کی جو بھی چیزیں ہیں وہ حقوق العباد کو تلف کرنے والی ہیں، بہر حال یہ بات تو اس حدیث کے تحت زبان پر آ گئی، لیکن بڑی اہم بات ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی عمل کرنے کی توفیق دے، آپ حضرات کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کی اہمیت اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرمائے۔

یہ دین چند ظاہری عبادتوں کا نام نہیں ہے۔ یہ ہمیں ایک ایک چیز کے بارے میں ہدایت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل عطائے۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ آج کی اس دنیا میں جب تک کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اس وقت تک ہمیں ان نیکیوں کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی ساری دولت روپے پیسے کو سمجھ رکھا ہے۔ میرے پاس بینک بیلنس زیادہ ہو جائے پیسے زیادہ ہو جائیں۔ بنگلہ بن جائے۔ کار مل جائے۔ بس ساری دوڑ دھوپ، سارا سوچ بچار کا محور ہم نے اس کو بنا رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے، کہ نیکیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

عبرت آموز واقعہ

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس اللہ سرہ مفتی اعظم پاکستان نے ــ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل فرمائے آمین ــ اپنا ایک واقعہ سنایا اور جو اللہ والے ہوتے ہیں یہ اپنے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آئے۔

اس سے کوئی نہ کوئی سبق لیتے ہیں اپنے بچپن کا واقعہ سناتے ہیں کہ بچپن میں جب میں چھوٹا سا بچہ تھا، اپنے ایک بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا اور دیو بند ہندوستان میں حضرت والدؒ کے زمانے کے بچوں کے کھیل آج کل کے بچوں کی طرح نئے نئے کھیل تو تھے نہیں۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کھیل ہوا کرتے تھے، یہ سرکنڈے ہوتے ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے پورے بنا کر اس سے بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایک بچے نے اپنا پورا نیچے کی طرف لڑکایا، دوسرے بچے نے بھی لڑکایا۔ جس کا پورا پہلے پہنچ گا وہ جیت گیا، اور وہ دوسرے سے ایک پورا لے لیتا تھا۔

فرمایا کہ میں یہ کھیل ایک مرتبہ اپنے بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا، بہت سارے پورے لے کر آیا، وہ بھی لے کر آئے تھے، اب جب کھیلنا شروع کیا تو جب بھی میں اپنا پورا لڑکاتا ہوں تو میرا پورا پیچھے رہ جاتا ہے بھائی کا پورا آگے بڑھ جاتا ہے اور ہر مرتبہ وہ مجھ سے ایک پورا لے لیتے یہاں تک کہ جتنے پورے لے کر آیا تھا وہ سارے کے سارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ اب میرے پاس کوئی پورا نہیں، اور بھائی جتنے لائے تھے ان کے پاس اس سے دوگنے ہو گئے، فرماتے ہیں کہ جب میں سارے کے سارے پورے ہار گیا مجھے آج تک یاد ہے کہ مجھے اتنا شدید صدمہ اور اتنا غم ہوا اور میں اس پر اتنا رویا کہ اس کے بعد اس سے بڑے سے بڑے نقصان پر اتنا صدمہ نہیں ہوا، اور یہ سمجھا کہ آج تو میری کائنات لٹ گئی۔ آج تو میری دنیا تباہ ہو گئی۔ یہ صدمہ اس وقت اتنا ہو رہا تھا کہ کسی بڑی سے بڑی جائیداد کے لٹ جانے پر بھی نہیں ہوتا۔

فرماتے ہیں کہ آج جب سوچتا ہوں کہ کس بات پر رویا تھا، کس بات پر صدمہ ہوا تھا۔ کس بات پر اتنا غم کیا تھا، ان معمولی، بے حقیقت، بے قیمت پوروں کے چھن جانے سے اتنا صدمہ ہو رہا تھا تو آج اس واقعہ کو یاد کر کے ہنسی آتی ہے، کتنی حماقت کی بات تھی، کتنی بے وقوفی کی بات تھی۔ پھر فرمایا اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم بے وقوف تھے، بچے تھے عقل نہیں تھی اس واسطے اس بے حقیقت چیز

کے کھو جانے پر اتنا صدمہ کر رہے تھے، اس لئے اب اس پر ہنستے ہیں لیکن اب سمجھتے ہیں کہ اب عقل آگئی ہے کہ وہ پورے بے حقیقت تھے در حقیقت یہ روپے پیسے یہ بنگلے، یہ جائیدادیں یہ کاریں، یہ ہیں اصل چیز کہ جن کو انسان حاصل کرے۔

لیکن فرماتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ پاس آخرت میں پہنچ جائیں گے تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ تمام چیزیں جن کے اوپر دنیا میں لڑ رہے تھے یہ زمین، یہ جائیداد، یہ دولت، یہ کوٹھیاں، یہ بنگلے یہ کاریں، یہ ساری کی ساری ایسی بے حقیقت تھیں جیسے کہ وہ سرکنڈے کے پورے، اور جس طرح آج اس بات پر ہنس رہے ہیں کہ پوروں کو چھن جانے سے افسوس ہو رہا تھا اسی طرح اس وقت ان کی حقیقت معلوم ہوگی کہ جو کوٹھیاں ہم بنایا کرتے تھے، جائیدادوں، پر زمینوں پر اور مال و دولت کی بنیاد پر جھگڑتے اور اکڑتے اور دنیا میں ان چیزوں کو دولت سمجھا کرتے تھے یہ حقیقی دولت نہیں تھی، حقیقت میں دولت یہ اعمال حسنہ تھے، جو جنت میں لے جانے والے ہیں۔

جنت کی راحت اور جہنم کی شدت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو بلائیں گے جس نے ساری عمر تکلیفوں میں مشقتوں میں، صدمات میں گزاری، اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری زندگی کیسی گزری؟ وہ کہے گا پروردگار! میری زندگی کا آپ کیا پوچھتے ہیں اتنے صدمے اٹھائے اتنی تکلیف سہی، اتنی پریشانیاں اٹھائیں کہ ساری عمر کوئی خوشی یاد نہیں، ساری عمر صدمات ہی صدمات میں گزری باری تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اس کو ذرا جنت کی باہر سے ہوا لگالاؤ۔ اس کو فرشتے لے جائیں گے، اور جنت کے باہر سے اس طرح سے ایک چکر لگا کر لے آئیں گے کہ جنت کی ہوا کا کوئی جھونکا لگ جائے گا، اس کے بعد اس سے پوچھیں گے کہ

اب بتا کیسی زندگی گزری وہ کہے گا پروردگار! میری زندگی تو اتنی عافیت میں گزری ہے کہ میں نے کسی غم کی شکل دیکھی ہی نہیں ہے۔ میں تو ساری عمر مسرتوں میں، عیش و عشرت میں اور بہت خوشی میں بسر کرتا رہا ہوں، اور میں نے کوئی تکلیف نہیں دیکھی، وہ جو ذرا سی جنت کی ہوا لگ گئی اس کی لذت، اس کی راحت اس کا سکون، اس کا اطمینان قلب میں اتنا پیارا ہوگا کہ ساری دنیا کی تکلیفوں کو بھول جائے گا۔

پھر فرمائیں گے ایسے شخص کو بلاؤ کہ جس نے دنیا کے اندر کسی غم کی شکل نہیں دیکھی کوئی صدمہ نہیں دیکھا بلکہ آرام میں عیش میں ساری عمر گزاری، اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری زندگی کیسی گزری، وہ کہے گا کہ یا اللہ! میری زندگی تو بڑے آرام کے ساتھ گزری، بڑے عیش و عشرت میں گزری کوئی صدمہ میرے پاس نہیں پھٹکا، کہا جائے گا کہ اس کو ذرا سی ایک ہوا جہنم کی لگاؤ باہر ہی سے اندر داخل مت کرنا۔ فرشتے اس کو لے جائیں گے اور جہنم کے پاس اس طرح سے گزار کر لے آئیں گے کہ جہنم کی لپٹ کا ذرا سا جھونکا اس کو لگ جائے گا۔

اس کے بعد اس سے پوچھا جائے گا اب بتاؤ، تمہاری زندگی کیسی گزری وہ کہے گا یا اللہ! میں تو ساری عمر تکلیف میں رہا ہوں، ساری عمر صدمات میں گزاری ہے خوشی کی کوئی شکل نہیں دیکھی۔ وہ چند لمحات کی جہنم کی ہوا۔ اس کی جو شدت ہے اور اس میں جو سختی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ اس کی وجہ سے ساری عمر کی راحتیں، مسرتیں، بھول جائے گا، یہ ہے جنت و جہنم کی راحت و شدت کا حال کہ اس کے مقابلہ میں ہم دنیا کو بھول جائیں گے۔

ہماری زبوں حالی

اور ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہمارے دماغ پر اور دل پر جو فکر مسلط ہے جو سوچ بچار ہے، جو دوڑ دھوپ ہے۔ وہ اس دنیا کے بے حقیقت

مال و متاع کے لئے ہے آخرت کی زندگی کو درست کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔

ایک مسئلہ پر دنیا کے تمام انسان متفق ہیں

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جس پر ساری دنیا کے انسان متفق ہوں ہر بات میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہے۔ لیکن ایک بات ایسی ہے، اس سے کسی فرد بشر کا اختلاف نہیں، اور وہ یہ ہے کہ مجھے ایک دن مرنا ہے موت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے خدا سے انکار کر دیا خدا کے وجود سے انکار کر دیا۔ رسالت سے انکار کر دیا۔ لیکن موت سے انکار کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں بڑے سے بڑے دھریہ، بڑے سے بڑا ملحد، کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ موت نہیں آئے گی ہر شخص اس کو مانتا ہے اور ساتھ ہی اس کو بھی مانتا ہے کہ اس مرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہو سکتا ہے اگلے لمحہ آجائے۔ ہو سکتا ہے کل آجائے، ہو سکتا ہے کہ دو دن کے بعد آجائے، ہو سکتا ہے کہ مہینے بعد آئے، ہو سکتا ہے کہ سال بھر میں آجائے بہت زیادہ جی لئے تو ستر سال اسی سال، پھر بہت ہی زیادہ جی لئے تو سو سال، اس کے بعد تو جانا ہی جانا ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور یہ بڑا عجیب واقعہ ہے یاد رکھنے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سفر پر جا رہے ہیں جاتے جاتے سفر کے دوران کچھ بھوک لگی، وہ ہوٹلوں، ریسٹورینٹوں کا زمانہ تو تھا نہیں کہ بھوک لگی تو کسی ہوٹل میں گھس گئے اور وہاں جاکر کھانا کھالیا۔ حضرت فاروق نے تلاش کیا کہ آس پاس بستی ہو لیکن وہاں کوئی بستی

بھی نہیں۔ تلاش کرتے کرتے دیکھا کہ ایک بکریوں کا ریوڑ چر رہا ہے، خیال ہوا کہ اس بکری والے سے کچھ دودھ لے کر پی لیں تاکہ بھوک مٹ جائے، تو دیکھا کہ چرواہا بکریاں چرا رہا ہے اس سے جاکر کہا کہ میں مسافر ہوں اور مجھے بھوک لگی ہے، مجھے ایک بکری کا دودھ نکال دو تو میں پی لوں، اور اس کی جو قیمت تم چاہو وہ میں تم کو ادا کر دوں۔

چرواہے نے کہا کہ جناب! میں ضرور آپ کو دودھ دے دیتا، لیکن یہ بکریاں میری نہیں ہیں میں تو ملازم ہوں۔ نوکر ہوں بکریاں چرانے کے لئے مجھے میرے مالک نے رکھا ہوا ہے، اور جب تک اس سے اجازت نہ لے لوں اس وقت تک مجھے آپ کو دودھ دینے کا حق نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو آزمایا بھی کرتے تھے۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں تمہیں تمہارے فائدے کی ایک بات بتاتا ہوں، اگر تم اس پر عمل کر لو۔ پوچھا کیا آپ نے فرمایا ایسا کر دکہ ان بکریوں میں سے ایک بکری میرے ہاتھ بیچ دو، پیسے میں تمہیں ابھی دیتا ہوں، میرا فائدہ تو یہ ہوگا کہ مجھے دودھ مل جائے گا۔ ضرورت ہوگی تو میں اسے کاٹ کر گوشت بھی کھالوں گا۔ اور پھر مالک جب تم سے پوچھے ایک بکری کہاں گئی؟ تو کہہ دینا کہ بھیڑیا کھا گیا۔ اور اس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئی اور بھیڑیا تو بکریوں کو کھاتا ہی رہتا ہے۔ کہاں مالک تمہاری تحقیق کرتا پھرے گا، بھیڑیے نے کھایا یا نہیں کھایا، تم ان پیسوں کو اپنی جیب میں رکھ کر ان کو اپنی ضرویات میں استعمال کرنا۔ ایسا کرلو، اس میں تمہارا بھی فائدہ، میرا بھی فائدہ۔

اس چرواہے نے یہ بات سنی اور سنتے ہی بے ساختہ جو کلمہ اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا "یاابن الملک! فاین اللہ؟ شہزادے تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں مالک سے جاکر جھوٹ بول دوں اور یہ کہہ دوں کہ بکری کو بھیڑیا کھا گیا۔ تو اللہ میاں کہاں گئے؟ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ بیشک میرا مالک مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔

لیکن مالک کا مالک، مالک الملک وہ دیکھ رہا ہے، اس کے پاس جاکر میں کیا

جواب دوں گا۔ ملک کو تو خاموش کر سکتا ہوں، لیکن ملک کے مالک کو کیسے خاموش کروں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک تجھ جیسے انسان اس امت کے اندر موجود ہیں اس وقت تک اس امت پر کوئی فساد نہیں آسکتا، جن کے اندر اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس موجود ہے جب تک یہ احساس باقی ہے اس وقت تک دنیا میں امن و سکون باقی ہے اور جب یہ ختم ہو گیا تو اس وقت انسان ،انسان نہ رہے گا۔ بلکہ بھیڑیا بن جائے گا، جیسا کہ آج کل بنا ہوا نظر آرہا ہے۔

انسان انسان نہیں درندہ بنا ہوا ہے، دوسرے کی بوٹیاں نوچنے کی فکر میں ہے دوسرے کی کھال اتارنے کی فکر میں ہے۔ دوسرے کا خون پینے کی فکر میں ہے، صرف اس دنیا کے کچھ فائدے حاصل کرنے کے لئے کہ اس کے کچھ فائدے حاصل ہو جائیں۔

ابدی زندگی کی فکر

نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فکر پیدا فرمائی کہ دنیاوی زندگی تو خدا جانے کتنے دن ہے۔ کب ختم ہو جائے اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ جو ابدی زندگی ملنے والی ہے اس کی فکر کرو اور وہاں کا سکہ روپیہ پیسہ نہیں ہے۔ تم لاکھ جمع کر لو۔ کروڑ کر لو۔ ارب کر لو۔ کھرب کر لو۔ سب یہیں دنیا میں چھوڑ کر جاؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ جانے والا نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی چیز جانیوالی ہے تو وہ نیک عمل ہے۔

ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مردہ قبرستان کی طرف لے جایا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے ساتھ جاتی ہیں، ایک اس کے عزیز واقارب جاتے ہیں اس کو چھوڑنے کے لئے، دوسرے اس کا مال

جاتا ہے۔ یعنی وہ کپڑے جو اس کے اوپر ہیں اور چار پائی ہے، جن میں اس کو لپیٹ کر لٹا کر لے جایا جارہا ہے اور تیسری چیز جو اس کے ساتھ جاتی ہے وہ اس کا عمل ہے، فرمایا پہلی دو چیزیں یعنی عزیز و اقارب اور مال قبر کے کنارے جانے کے بعد واپس ہو جاتے ہیں آگے جانے والی چیز ایک ہی ہے اور وہ اس کا عمل ہے خواہ وہ نیک عمل ہے یا اس کا برا عمل ہے۔

اس واسطے وہاں کا سکہ یہ روپیہ پیسہ نہیں، یہ مال و دولت نہیں، وہاں کا سکہ نیکیاں ہیں اور ان نیکیوں کے حصول کے لئے سب سے بڑی دولت جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی وہ یہ قرآن کریم کی دولت ہے۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ قرآن کریم اس امت کے واسطے نسخہ شفا بنا کر بھیجا۔ اس کا پڑھنا اس کا سمجھنا، اس پر عمل کرنا۔ اس کی دعوت دینا، اس کی تبلیغ کرنا، سب انسان کے لئے موجب اجر و ثواب ہے موجب سعادت ہے۔

قرآن کریم کی قدر کا طریقہ

نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسی چیز چھوڑ کر جارہا ہوں جب تک اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے اس وقت تک کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب، یہ چھوڑ کر آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور اس کی قدر پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کم از کم اتنا تو کرے کہ ہم مسلمانوں میں سے کسی کا بچہ بھی قرآن کریم کی تعلیم کے بغیر نہ رہے، جب تک قرآن مجید ناظرہ نہ پڑھ لے اس وقت تک اس کو کسی اور کام میں نہ لگایا جائے۔

ایک وقت تھا جب صبح کے وقت مسلمانوں کی بستیوں سے ہر طرف سے قرآن کریم کی تلاوت کی آوازیں آیا کرتی تھیں، لیکن اب قرآن کریم کی تلاوت کو کان ترستے ہیں۔ اب فلمی گانوں کی آوازیں آئیں گی اور طرح طرح کے خرافات کی

آوازیں آئیں گی۔ نہیں آئے گی تو قرآن مجید کی تلاوت کی آواز نہیں آئے گی۔

مسلمانوں کا فرض

درحقیقت یہ مدارس اس غرض کے لئے ہیں کہ امت میں دینی شعور کو بیدار کیا جائے، تاکہ قرآن کریم کی طرف لوٹیں اور قرآن کریم کے الفاظ، اس کے معانی، اس کے مفاہیم پھیلانے اور پہچانے کی فکر کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ آپ کے محلّہ میں یہ مدرسہ یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہر طرح کی ظاہری اور باطنی ترقیات عطا فرمائے۔ ابھی مدرسہ کے حضرات یہ کہہ رہے تھے اور بجا طور پر کہہ رہے تھے کہ یہ دین کی خدمت کا ادارہ ہے۔ تمام مسلمانوں کو اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کے لئے کھپائی ہے اور قرآن کریم کی خدمت کے لئے کم از کم ان کو اس فکر سے آزاد کریں کہ وہ لوگوں کے پاس پیسے نہ مانگتے پھریں، بیشک یہ مسلمانوں پر فرض ہے

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ ضروری چندہ جو مسلمانوں سے اس وقت لینے کی ضرورت ہے وہ ہے بچوں کا چندہ، جو مسلمان گھرانوں سے حاصل کئے جائیں، جن کو قرآن کریم کی تعلیم دی جائے، اب یہ وبا پھیل چکی ہے کہ قرآن کریم کو پڑھائے بغیر دنیا کے دوسرے کاموں کے اندر لگا دیتے ہیں اور قرآن کریم کی دولت سے بچہ محروم رہتا ہے۔

بچپن کی تعلیم

بچپن میں ایک مرتبہ قرآن پڑھا دو۔ اس کے قلب کو قرآن کریم سے

منور کرو۔ اس کے بعد اس کو کسی بھی کام میں لگاؤ گے تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ قرآن کے انوار و برکات اس کے اندر شامل حال ہوں گے، جب قرآن اس کو پہلے پڑھا دیا اس کے کان کے ذریعے ایمان کا بیج اس کے قلب میں پیوست کر دیا اور تجربہ یہ ہے کہ جو بچے مکتب میں قرآن کریم پڑھ کر جاتے ہیں تو وہ کسی بھی ماحول میں چلے جائیں لیکن ایمان کا بیج ان کے قلب میں موجود رہتا ہے۔

اگر آپ نے شروع ہی سے بچہ کو بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمد اللہ اور قرآن کریم کی آیات سکھانے کے بجائے اس کو کٹ پٹ سکھانی شروع کر دی اور اس کے دماغ کے اوپر کتے بلی کو مسلط رکھا، اور قرآن کریم کے انور و برکات کو اس کے دل میں داخل نہ ہونے دیا، تو اس کے دل میں ایمان کہاں سے آئے گا۔ اس کے دل میں اسلام کی محبت کہاں سے آئے گی۔ اس کے دل میں آخرت کی فکر کیسے پیدا ہوگی۔ پھر تو وہی مادہ پرست انسان پیدا ہوگا جو ہمیں چاروں طرف گھومتا ہوا نظر آرہا ہے، جس کو اللہ کے حضور کھڑے ہونے کا احساس بھی نہیں، جو دوسروں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ دوسروں کی کھال کھینچتا ہے۔

اگر اپنے بچوں کے مستقبل پر رحم کرنا ہے تو خدا کے لئے جب تک انہیں قرآن کریم کی تعلیم نہ دلا دیں اس وقت تک ان کو کسی اور کام میں نہ لگائیں، آج کی محفل سے اگر ہم یہی فائدہ اٹھالیں کہ ہم یہ عہد کر کے یہاں سے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص یہ عزم کر کے جائے کہ اپنے بچو کو جب تک قرآن کریم نہیں پڑھائیں گے س وقت تک کسی اور کام میں نہیں لگائیں گے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس مجلس کا بہت بڑا فائدہ ہم نے حاصل کر لیا۔ ورنہ تقریریں اور باتیں تو دنیا میں بہت ہوتی ہیں۔ آپ حضرات تشریف لائے میرے جو سمجھ میں آیا وہ میں نے عرض کیا۔

نشستند و گفتند و برخاستند

ایک کان سے سنا دوسرے کان سے نکل کر اور دامن جھاڑ کر چل

دیئے، اس سے کچھ حاصل نہیں کچھ فائدہ نہیں، اگر کم از کم یہ ارادہ لے کر چلے کہ اپنی حد تک تمام بچوں کو قرآن کریم پڑھائیں گے اور اپنے ملنے جلنے والوں دوستوں اور عزیز واقارب کو بھی اس طرف متوجہ کریں گے، انشاء اللہ اس کا فائدہ ہو گا، اللہ تعالیٰ نے جو باتیں کہلوا دی ہیں۔ مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے اور آپ حضرات کو بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے اور اس مجلس میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ اور اس مدرسہ کو بھی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقیات سے نوازے اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دِل کی بیماریاں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب: حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب: عبدالقادر احمر

تاریخ و وقت: ۱۸ر دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ، بعد نماز عصر

مقام: جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی

جس طرح انسان کے جسم کو بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی بخار ہو گیا کبھی پیٹ میں درد، کبھی قبض ہو گیا۔ کبھی دست آگئے، کبھی سر میں درد، کبھی کمر میں تکلیف، اسی طرح انسان کی روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔ وہ بیماریاں یہ ہیں کہ کبھی تکبر پیدا ہو گیا، کبھی حسد پرورش پانے لگا، کبھی بغض پیدا ہو گیا۔ کبھی ناشکری پیدا ہو گئی، یہ سب روح کی بیماریاں ہیں۔ ان کا بھی علاج ضروری ہے، اور ان کو چھوڑنا واجب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دل کی بیماریاں
اور
طبیب روحانی کی ضرورت

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

امابعد! قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ. واذا فسدت فسد الجسد کلہ، الا وھی القلب۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ۳ ص ۱۵۳)

اخلاق کی اہمیت

اخلاق کی درستی اور اس کو اللہ جل جلالہ کے احکام کے مطابق بنانا اتنا ہی ضروری اور اتنا ہی اہم اور واجب ہے جتنا کہ عبادات کو بجالانا ضروری ہے، بلکہ اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ عبادات، معاملات اور معاشرت کے جتنے احکام ہیں، ان میں سے کوئی بھی حکم اس وقت تک صحیح طریقے سے بجا نہیں لایا جاسکتا، جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔ اگر اخلاق درست نہ ہوں تو بعض اوقات یہ نماز روزہ بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ نہ صرف بیکار، بلکہ الٹا وبال بن جاتا ہے، اسی لئے اخلاق کی درستی اور اس کو اللہ

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق بنانا عملی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد نہ ہو تو عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔

اخلاق کیا چیز ہیں؟

اخلاق کا مطلب آجکل عرف عام میں کچھ اور سمجھا جاتا ہے اور جس اخلاق کی میں بات کر رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ عرف عام میں اخلاق اس کو کہتے ہیں کہ ذرا مسکرا کر کسی آدمی سے مل لئے، اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے، نرمی سے بات کرلی، اس کو کہتے ہیں کہ یہ بہت خوش اخلاق آدمی ہے، اس کے اخلاقیات بہت اچھے ہیں۔ لیکن جس اخلاق کی میں بات کر رہا ہوں اور جس اخلاق کا مطالبہ دین نے ہم سے کیا ہے اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ صرف اتنی بات نہیں ہے کہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے مل لئے۔ یہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے لیکن اصل اخلاق یہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل اخلاق انسان کے باطن کی، اس کے دل کی، اس کی روح کی ایک صفت ہے۔ انسان کے باطن کے اندر مختلف قسم کے جذبات، خیالات، خواہشات پروان چڑھتے ہیں، ان کو اخلاق کہتے ہیں اور ان کو درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

روح کی اہمیت

اس بات کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کس کو کہتے ہیں؟ انسان نام ہے جسم اور روح کے مجموعے کا۔ صرف جسم کا نام انسان نہیں بلکہ انسان وہ جسم ہے جس میں روح موجود ہو۔ فرض کرو کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ بتائیے کہ اس کے ظاہری جسم میں کیا فرق واقع ہوا؟ آنکھ اسی طرح موجود ہے، ناک اسی طرح موجود ہے، کان اسی طرح موجود ہیں، زبان اسی طرح موجود ہے، چہرہ ویسا ہی ہے، ہاتھ پاؤں ویسے ہی ہیں۔ سارا جسم جوں کا توں ہے لیکن کیا فرق پیدا ہوا؟ فرق یہ ہوا کہ پہلے اس جسم کے اندر روح سمائی ہوئی تھی، اب وہ روح نکل گئی۔ اور روح کے نکل جانے سے انسان، انسان نہیں رہتا، لاش بن جاتا ہے، جمادات میں داخل ہو جاتا ہے۔

جلدی سے دفن کر دو

وہی انسان جو روح نکلنے سے پہلے دیکھنے والوں کی نگاہوں کا پیارا تھا، عزیز تھا، لوگ اس سے محبت کرتے تھے، زمین جائداد کا مالک تھا، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا تھا، دوست احباب کا عزیز تھا، سبھی کچھ تھا، لیکن ادھر روح جسم سے نکلی، ادھر نہ تو زمین جائداد اس کی رہی، نہ وہ بیوی کا شوہر رہا اور نہ بچوں کا خبر گیری کرنے والا رہا جو لوگ اس سے محبت کرتے تھے، اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، اب وہ اس فکر میں ہیں کہ جلد از جلد اس کو اٹھا کر قبر میں پہنچا کر ٹھکانے لگائیں۔ کوئی کہے کہ بھئی یہ تمہارا عزیز ہے اس کو ذرا اپنے گھر میں رکھ لو، تو کوئی اس کو رکھنے کو تیار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن رکھے گا، بہت کوئی رکھ لے گا تو برف وغیرہ لگا کر ہفتہ بھر رکھ لے گا، لیکن اس سے زیادہ کوئی نہیں رکھے گا۔ اب سب اس فکر میں ہیں کہ جلد سے جلد اٹھا کر اس کو قبر میں پھینکو اور دفن کرو۔ وہی محبت کرنے والے جو دن رات اس کی چشم و ابرو کو دیکھتے تھے، اس کے اشاروں پر ناچتے تھے، روح کے نکلنے کے بعد اب یہ حالت ہو گئی کہ بیٹا اپنے ہاتھ سے باپ کو قبر میں رکھنا چاہتا ہے اور مٹی دے کر جلد از جلد اس کو دفن کر دینا چاہتا ہے بلکہ کسی نے قصہ بتایا کہ اخبار میں چھپا تھا کہ ایک آدمی کو، جسے شاید سکتہ ہو گیا تھا، لوگوں نے غلطی سے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا۔ جب سکتہ ختم ہوا تو وہ بیچارہ قبر پھاڑ کر کسی طرح گھر پہنچا۔ جب اس نے دستک دی تو باپ نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے۔ جب اس نے اپنا نام بتایا تو باپ گھر سے لاٹھی لے کر نکلا اور لاٹھی سے اس کو مارا کہ یہ اس کا بھوت کہاں سے آگیا۔ جو غریب پہلے نہیں مرا تھا، اب لاٹھی سے مر گیا۔

آخر یہ کیا انقلاب عظیم واقع ہوا کہ سارا جسم اسی طرح ہے جیسے پہلے تھا مگر اب کوئی اس کو گھر میں رکھنے کو تیار نہیں؟ فرق یہ واقع ہوا کہ اس کے جسم سے روح نکل گئی، معلوم یہ ہوا کہ انسان کے جسم کے اندر اصل چیز اس کی روح ہے۔ جب تک یہ روح انسان کے اندر موجود ہے اس وقت تک انسان انسان ہے، لیکن جب یہ روح نکل جائے تو پھر وہ انسان نہیں ہے، محض ایک لاش ہے جس سے کسی کو کوئی تعلق نہیں، سب اس فکر میں ہیں کہ اس کو جلد سے جلد قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیں۔

روح کی بیماریاں

جس طرح انسان کے جسم کے اندر بہت سی صفات ہوتی ہیں کہ بعض اوقات جسم صحتمند ہے، خوبصورت ہے، طاقتور ہے، توانا ہے اور بعض دفعہ جسم نحیف کمزور، دبلا پتلا، بیمار، بدصورت ہے، اسی طرح انسان کی روح کی بھی کچھ صفات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات روح طاقتور ہوتی ہے اور بعض اوقات کمزور ہوتی ہے۔ بعض اوقات روح اچھی صفات کی مالک ہوتی ہے اور بعض اوقات خراب صفات کی مالک ہوتی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کو بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی بخار ہو گیا، کبھی پیٹ خراب ہو گیا، کبھی قبض ہو گیا، کبھی دست آگئے، اسی طرح روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔ روح کو کیا بیماریاں لگتی ہیں؟ روح کو یہ بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی اس میں تکبر پیدا ہو گیا، کبھی اس میں حسد پرورش پانے لگا، کبھی اس میں بغض پیدا ہو گیا، کبھی اس میں ناشکری پیدا ہو گئی۔ یہ ساری کی ساری روح کی بیماریاں ہیں۔

روح کا حسن و جمال

اسی طرح جیسے انسان کے جسم کی خوبصورتی ہے مثلاً کہتے ہیں کہ اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے، اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں، اس کا جسم بہت خوبصورت ہے۔ اسی طرح روح کی بھی کچھ خوبصورتی ہے، اس کا بھی کچھ جمال ہے، اس کا بھی کچھ حسن ہے۔ روح کا حسن کیا ہے؟ روح کا حسن یہ ہے کہ انسان کے اندر تواضع ہو، صبر و شکر ہو، اخلاص ہو، خود پسندی نہ ہو، ریاکاری نہ ہو۔ یہ سب روح کا حسن و جمال ہے۔

جسمانی عبادات

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو بہت سے احکام دیئے ہیں۔ جن کا تعلق ہمارے ظاہری جسم سے ہے، مثلاً نماز ہے کہ نماز کس سے پڑھی جاتی ہے؟ جسم کو کبھی کھڑا کیا جاتا ہے، کبھی رکوع میں چلے جاتے ہیں، کبھی سجدے میں چلے جاتے ہیں، کبھی سلام پھیرتے

ہیں۔ یہ ساری حرکات جسم کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ تو یہ ایک جسمانی عبادت ہے۔ روزہ کس طرح رکھتے ہیں؟ ایک مقررہ وقت تک بھوکے پیاسے رہتے ہیں، یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔ مال کی ایک خاص مقدار غریب کو دینا فرض کیا گیا ہے، جس کو زکوۃ کہتے ہیں۔ یہ بھی اپنے ہاتھ سے دی جاتی ہے اور حج بھی ایک جسمانی اور مالی عبادت ہے۔ حج کے اندر محنت کرنی پڑتی ہے، سفر کرنا پڑتا ہے، خاص ارکان انجام دینے پڑتے ہیں۔ یہ سارے کام جسم سے ادا کئے جاتے ہیں اس لئے یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔

تواضع دل کا فعل ہے

جس طرح یہ ساری عبادتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے جسم سے متعلق رکھی ہیں۔ اسی طرح بہت سے فرائض ہماری روح اور باطن سے متعلق رکھے ہیں، مثلاً یہ حکم دیا کہ ہر انسان کو تواضع اختیار کرنی چاہئے۔ اب یہ تواضع جسم کا فعل نہیں ہے۔ یہ دل کا فعل ہے، باطن کا فعل ہے، روح کا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ یہ صفت اپنے دل میں پیدا کی جائے۔

بہت سے بے پڑھے لکھے لوگ تواضع کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا تو اس کی خاطر تواضع کر دو، کچھ کھلا وغیرہ اس کو کھلا دو، اس کو تواضع کہتے ہیں۔ تواضع کا مطلب یہ نہیں ہے۔ جو کچھ پڑھے لکھے ہیں، وہ بھی تواضع کا مطلب سمجھتے ہیں انکسار، دوسروں سے انکساری کے ساتھ پیش آنا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کی ذرا گردن جھکی ہوئی ہو، کچھ سینہ مڑا ہوا ہو، تو جو آدمی اس طرح لوگوں سے ملتا ہے، اس کو کہتے ہیں بڑا منکسر المزاج آدمی ہے، بہت متواضع ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ تواضع کا کوئی تعلق جسم سے نہیں ہے۔ تواضع کا تعلق قلب اور روح سے ہے انسان اپنے دل میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھے کہ میری کوئی حقیقت نہیں ہے، میری کوئی قدرت نہیں ہے، میں تو ایک بیکس، بے بس بندہ ہوں۔ یہ خیال دل کے اندر پیدا ہو جائے، اس کو کہتے ہیں تواضع اور اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم دیا ہے۔

اخلاص دل کی ایک کیفیت ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اخلاص کا حکم دیا ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو۔ عبادتوں میں اخلاص پیدا کرو، جو کام کرو اللہ جل جلالہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لئے کرو، یہ ہے اخلاص۔ اخلاص زبان سے کہنے سے نہیں حاصل ہوتا۔ یہ دل کی ایک کیفیت ہے۔ باطن کی ایک صفت ہے، جس کو حاصل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

شکر دل کا عمل ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے شکر کا حکم دیا ہے کہ جب کوئی نعمت تمہیں حاصل ہو تو اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرو۔ یہ شکر بھی انسان کے قلب کا فعل ہے، انسان کی روح کا فعل ہے۔ جتنا شکر ادا کرے گا، روح اتنی ہی زیادہ طاقتور ہوگی۔

صبر کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے صبر کا حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو سمجھو کہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہے، جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت سے ہوا ہے، اس کی مشیت کے مطابق ہے۔ چاہے یہ مجھ کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی مصلحت اسی میں تھی۔ انسان ہر ناگوار واقعے کے وقت یہ سوچے اور اس کا احساس دل میں پیدا کرے، اس کو صبر کہتے ہیں۔

اخلاق باطنہ کا حصول فرض ہے

لہٰذا بہت سے احکام ایسے ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری روح اور ہمارے باطن سے متعلق، ہم کو عطا فرمائے ہیں۔ یاد رکھئے کہ صبر کے موقع پر صبر کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ نماز پڑھنا فرض ہے، شکر کے موقع پر شکر کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ روزہ رکھنا فرض ہے، اخلاص کے موقع پر اخلاص کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ زکوٰۃ دینا فرض

ہے۔ یہ سب بھی فرائض ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں۔

باطنی بیماریاں حرام ہیں

بہت سے کام ظاہری اور جسمانی اعتبار سے گناہ قرار دیئے گئے ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، رشوت لینا، سود کھانا، شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا۔ یہ سارے کے سارے کام گناہ ہیں جو ہمارے ظاہری جسم سے متعلق ہیں، ہمارے اعضا سے سرزد ہوتے ہیں اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سے باطنی کاموں کو بھی گناہ قرار دیا ہے، مثلاً تکبر ایک باطنی بیماری ہے جو ہاتھ پاؤں سے انجام نہیں دی جاتی، یہ انسان کے باطن کا ایک روگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اتنا ہی حرام ہے جتنا شراب پینا حرام ہے، جتنا سور کھانا حرام ہے، جتنا زنا اور بدکاری کرنا حرام ہے۔ اسی طرح حسد بھی ایک باطنی بیماری ہے اور اس کو بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ بھی اتنا ہی حرام ہے جتنے وہ گناہ حرام ہیں جن کا میں نے پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے باطن اور روح سے متعلق بھی کچھ احکام رکھے ہیں۔ کچھ صفات کو پیدا کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ جن صفات کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ صفات اپنے باطن کے اندر پیدا کر لے، اور جن صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے وہ صفات اپنے باطن سے الگ کر لے تو کہیں گے کہ اس کے اخلاق درست ہو گئے۔ اخلاق انہی باطنی کیفیات اور روح کی صفات کا نام ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اچھے اخلاق، جن کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے، ان کو اخلاق فاضلہ اور برے اخلاق، جن کو دور کرنا چاہئے، ان کو اخلاق رذیلہ کہتے ہیں۔

امید ہے کہ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اخلاق کا مطلب ایک دوسرے سے اچھی طرح بات کر لینا یا اچھی طرح مسکرا دینا نہیں ہے۔ یہ اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو انسان کا رویہ ہر دوسرے انسان کے ساتھ بہتر ہو جاتا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس کو اخلاق نہیں کہتے۔ اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا باطن درست ہو جائے، اخلاق فاضلہ پیدا ہو جائیں، اخلاق رذیلہ دور ہو جائیں اور انسان

کا باطن اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کے مطابق ڈھل جائے۔

غصہ کی حقیقت

اخلاق کی اصلاح کیسے ہوتی ہے؟ یہ بات ایک مثال کے ذریعے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائیگی مثلاً غصہ انسان کے باطن کی ایک صفت ہے۔ یہ غصہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کا مظاہرہ بعض اوقات ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، بعض اوقات زبان سے، جب غصہ آگیا اور غصے سے مغلوب ہو گیا تو چہرہ سرخ ہو گیا، رگیں تن گئیں، زبان بے قابو ہو کر اول فول بکنے لگی، ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ یہ غصہ کا نتیجہ ہے لیکن اصل غصہ اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ غصہ ایسی چیز ہے کہ بے شمار باطنی رذائل کی بنیاد اور جڑ ہے اس کی وجہ سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہے۔

غصہ نہ آنا ایک بیماری ہے

اگر یہ غصہ انسان میں بالکل بھی نہ ہو، کوئی کچھ بھی کرتا رہے، لیکن اس کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں، یہ بھی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو غصہ اس مقصد کے لئے دیا ہے کہ انسان اپنا، اپنی جان کا، اپنی آبرو کا، اپنے دین کا دفاع کر سکے۔ اب اگر کوئی شخص پستول تانے کھڑا ہے اور اس کی جان لینا چاہتا ہے اور ان صاحب کو غصہ آتا ہی نہیں، یہ بیماری ہے۔ اگر کوئی آدمی ــــ نعوذ باللہ ــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اس وقت ایک آدمی کو غصہ آتا ہی نہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ بیمار ہے۔ یہ مواقع ایسے تھے کہ غصہ آنا چاہئے تھا، اگر نہیں آرہا تو یہ بیماری ہے۔

غصہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے

اور اگر غصہ حد اعتدال سے زیادہ ہے تو یہ بھی بیماری ہے۔ غصہ اس لئے آئے تاکہ دوسرے، آدمی کے شر سے اپنی حفاظت کر سکے۔ اس حد تک تو غصہ صحیح ہے۔ اب

اگر غصہ کرنے کی جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ کر رہا ہے۔ مثلاً ایک تھپڑ مار دینے سے کام چل سکتا تھا لیکن اب یہ غصہ میں آکر ایک تھپڑ کے بجائے مارے چلا جا رہا ہے۔ یہ غصہ حد اعتدال سے زیادہ ہے اور گناہ ہے۔ لہٰذا غصہ اگر کم ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری اور زیادہ ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری۔ غصہ اعتدال کی حد میں ہونا چاہئے کہ ضرورت کے موقع پر آئے اور بلا ضرورت نہ آئے اور اگر بلا ضرورت آئے بھی تو آدمی اس کو استعمال نہ کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غصہ

حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہہ دیا۔ حضرت علیؓ کہاں سننے والے تھے۔ وہ اس یہودی کو گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ یہودی نے جب دیکھا کہ اب کچھ اور نہیں کر سکتا تو اس نے وہیں زمین پر لیٹے لیٹے حضرت علیؓ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ آپؓ نے کیا کیا؟ اب تو اس نے مزید گستاخی کی۔ اس کو اور مارنا چاہئے تھا۔ فرمایا کہ "اصل میں بات یہ ہے کہ پہلے میں نے اس کو اس لئے سزا دی تھی کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اس وقت میرا غصہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی حفاظت کے لئے تھا۔ اس واسطے میں اس پر چڑھ بیٹھا۔ جب اس نے مجھ پر تھوکا تو میرے دل میں اپنی ذات کے لئے غصہ پیدا ہوا کہ اس نے میرے منہ پر کیوں تھوکا۔ اپنی ذات کا انتقام لینے کا جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اپنی ذات کے لئے انتقام لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ اس لئے میں اسے چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا"۔ یہ ہے غصے میں اعتدال کہ پہلے غصے کا صحیح موقع تھا تو غصہ آیا اور اس پہ عمل بھی کیا اور دوسرے غصے کا صحیح موقع نہیں تھا اس لئے اس پر عمل نہیں کیا اور اس یہودی کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔

حد اعتدال کی ضرورت

انسان کے باطن کے جتنے بھی اخلاق ہیں ان سب کا یہی حال ہے کہ اپنی ذات میں وہ برے نہیں ہوتے۔ جب تک وہ حد اعتدال میں رہیں اس وقت تک وہ صحیح ہیں لیکن اگر اعتدال سے کم ہو گئے تو وہ بھی بیماری اور اعتدال سے زیادہ ہو گئے تو وہ بھی بیماری۔ اصلاح نفس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان اخلاق کو اعتدال پر رکھا جائے، نہ کم ہوں نہ زیادہ ہوں۔

دل کی اہمیت

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله

واذا فسدت فسد الجسد کله، الا وهی القلب۔

(اتحاف ج ۳ ص ۱۰۲)

یعنی خوب یاد رکھو کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔" پھر فرمایا کہ خوب سن لو کہ وہ لوتھڑا جس کی وجہ سے سارا جسم صحیح ہوتا ہے یا خراب ہوتا ہے وہ انسان کا دل ہے۔ مگر اس لوتھڑے سے وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں ہے اس لئے کہ اگر دل کو چیر کر دیکھو تو اس میں یہ بیماریاں نظر نہیں آئیں گی نہ تکبر نظر آئے گا، نہ حسد نظر آئے گا، نہ بغض نظر آئے گا اور اگر ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ دل کی ظاہری بیماریاں چیک کر کے بتا دے گا کہ اس کی دھڑکن صحیح ہے یا نہیں ہے، رگیں صحیح کام کر رہی ہیں یا نہیں، اس میں خون کی سپلائی صحیح ہو رہی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں جو چیک اپ اور آلات کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہیں، یہ دل کے صرف ظاہری عمل کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

یہ اندیکھی بیماریاں ہیں

لیکن انسان کے قلب کے ساتھ کچھ چیزیں ایسی وابستہ ہیں جو اندیکھی ہیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔ وہ یہی ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا یعنی یہ کہ دل میں شکر ہے یا نہیں؟ حسد ہے یا نہیں؟ بغض ہے یا نہیں؟ صبر و شکر کی کیفیات ہیں یا نہیں؟ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہری امراض کا ڈاکٹر دیکھ کر نہیں بتا سکتا اور کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے چیک کر کے بتا دیا جائے کہ اس کو یہ باطنی بیماری ہے۔

دل کے ڈاکٹر، صوفیہ کرام

اس بیماری کے ڈاکٹر، اس کی تشخیص کرنے والے، اس کا علاج کرنے والی کوئی اور ہی قوم ہے۔ یہی وہ قوم ہے جن کو "حضرات صوفیاء کرام" کہتے ہیں۔ جو علم الخلاق کے ماہر ہوتے ہیں باطن کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کرتے ہیں یہ ایک مستقل فن ہے ایک مستقل علم ہے اس کو بھی اسی طریقے سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جس طرح ڈاکٹری پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔

پھر آپ نے ظاہری بیماری میں دیکھا ہو گا کہ بہت سی ظاہری بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا انسان کو خود پتہ لگ جاتا ہے۔ بخار ہو گیا تو معلوم ہو گا کہ گرمی لگ رہی ہے، بدن میں درد ہے، معلوم ہو گا کہ بخار ہے، بیمار خود بھی پہچان لے گا کہ بخار ہے اور اگر خود نہیں پہچان سکے گا تو تھرمامیٹر لگا کر دیکھ لے گا، اس سے پتہ چل جائے گا کہ بخار ہے۔ اگر خود بھی نہیں پہچان سکا، اسکے گھر والے ذاتی آلات سے بھی نہیں پہچان سکے تو ڈاکٹر کے پاس چلا جائے گا، وہ ڈاکٹر بتا دے گا کہ فلاں بیماری ہے۔

لیکن باطن کی بیماریاں ایسی ہیں کہ نہ تو بسا اوقات مریض کو خود پتہ لگتا نہیں کہ میرے اندر یہ بیماری ہے اور نہ کوئی آلہ ایسا انسان کے پاس موجود ہے جس سے پتہ لگ جائے کہ تکبر کا ٹمپریچر کیا ہے؟ اور ظاہری ڈاکٹر کے پاس جائے تو وہ بھی بے چارہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر یہ بیماری ہے یا نہیں؟ اس کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کسی باطن کے معالج کے پاس جا کر تشخیص کرائے کہ میرے اندر تکبر ہے یا نہیں۔

تواضع یا تواضع کا دکھلوا

تواضع کا مطلب آپ کی سمجھ میں آگیا کہ تواضع کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھنا۔ اس کو عرف عام میں انکساری بھی کہتے ہیں۔ اب سنئے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات لوگ کہتے ہیں کہ میں تو بڑا بیکار آدمی ہوں، میں تو بے حقیقت ہوں، جاہل ہوں، بہت گناہ گار ہوں، بڑا ناچیز آدمی ہوں، میری کوئی حقیت نہیں ہے۔ اس سے بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بے چارہ بہت تواضع کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت، ناکارہ، ناچیز جاہل اور گناہ گار سمجھ رہا ہے۔

بظاہر دیکھنے میں یہ تواضع معلوم ہو رہی ہے لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یہ الفاظ کہہ رہا ہوتا ہے حقیقت میں وہ متواضع نہیں ہوتا بلکہ اس میں دو بیماریاں ہوتی ہیں، ایک تکبر اور دوسری تواضع کا دکھلوا۔ یعنی یہ جو کہہ رہا ہے کہ میں بڑا بے حقیقت آدمی ہوں، جاہل آدمی ہوں، یہ سچے دل سے نہیں کہہ رہا، بلکہ اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ دیکھنے والے اس کو متواضع سمجھیں اور کہیں کہ یہ تو بڑا منکسر المزاج ہے۔

ایسے شخص کی آزمائش کا طریقہ

حضرت فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو کہ میں بڑا گناہ گار، جاہل، ناکارہ اور ناچیز ہوں، اسکے امتحان کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اگر اس وقت دوسرا آدمی یہ کہہ دے کہ بے شک آپ ناکارہ بھی اور ناچیز بھی، گناہ گار بھی، جاہل بھی اور بے حقیت بھی، پھر دیکھو کہ اس وقت اسکے دل پر کیا گزرے گی؟ کیا اس کا شکر گزار ہو گا کہ آپ نے بڑی اچھی بات کہی؟ میرے خیال میں تقریباً سو فیصد معاملات میں اگر دوسرا کہہ دے گا کہ بے شک آپ ایسے ہی ہیں، تو طبیعت کو بڑی ناگواری ہوگی کہ دیکھو اس نے مجھے ناچیز، ناکارہ اور جاہل کہہ دیا۔

معلوم ہوا کہ صرف زبان سے کہہ رہا تھا کہ ناکارہ ہے، ناچیز ہے جاہل ہے، لیکن دل میں یہ خیال نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ جب میں اپنی زبان سے کہوں گا کہ جاہل ہوں، ناکارہ ناچیز ہوں، تو سامنے والا یہ کہے گا کہ نہیں حضرت! یہ تو آپ کی تواضع ہے۔ آپ تو حقیقت میں بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔ بڑے متقی پارسا ہیں۔ یہ کہلوانے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے اور دکھلاوا کر رہا ہے کہ میں بڑا متواضع ہوں۔ حقیقت میں دل میں تکبر بھرا ہوا ہے دکھلاوا بھرا ہوا ہے اور ظاہر یہ کر رہا ہے کہ میں بہت متواضع ہوں۔

آپ اندازہ لگائیے کہ اس کو کون پہچانے گا کہ یہ الفاظ سچے دل سے کہے جارہے ہیں یا اندر بیماری بھری ہوئی ہے؟ اس کو تو وہی پہچان سکتا ہے جو باطنی امراض کا ماہر اور معالج ہو۔ اسی لئے ضرورت ہوتی ہے معالج کے پاس جانے کی کہ اکثر اوقات انسان خود اپنے باطنی امراض کو نہیں پہچان سکتا۔

دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا

ایک صاحب میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن والد صاحب نے دیکھا کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دئے اس کے بعد سے ہر دفعہ وہ آکر پہلے مجلس میں آنے والوں کو جوتے سیدھے کرتے اور پھر مجلس میں بیٹھتے۔ والد صاحب نے کئی دفعہ ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو ایک دن ان کو منع کر دیا کہ یہ کام مت کیا کرو۔ پھر بعد میں بتایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ یہ بے چارہ یہ سمجھا تھا کہ میرے اندر تکبر ہے اور اس تکبر کا علاج اپنی رائے سے تجویز کر لیا کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کروں گا تو اس سے میرا تکبر دور ہو گا۔ تو والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس علاج سے فائدہ ہونے کے بجائے اس کو الٹا نقصان ہوتا، تکبر اور عجب میں اضافہ ہوتا۔ اس لئے کہ جب جوتے سیدھے کرنے شروع کئے، تو دل و دماغ میں یہ بات پیدا ہوتی کہ میں نے تو اپنے آپ کو مٹا دیا، میں نے تو تواضع کی حد کر دی کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دئے۔ اس سے مزید خود پسندی پیدا ہوتی اس لئے اسے روک دیا کہ تمہارا کام یہ نہیں،

اور اس کے لئے دوسرا علاج تجویز فرمایا۔

اب بتایئے: بظاہر دیکھنے میں جو شخص دوسرں کے جوتے سیدھے کر رہا ہے وہ متواضع معلوم ہو رہا ہے لیکن جاننے والا جانتا ہے کہ یہ کام حقیقت میں تکبر پیدا کر رہا ہے تواضع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا نفس کے اندر اتنے باریک نکتے ہوتے ہیں کہ آدمی خود سے انداز نہیں لگا سکتا، جب تک کہ کسی باطنی امراض کے ماہر سے رجوع نہ کرے اور وہ نہ بتائے کہ تمہارا یہ عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی حد کے اندر ہے یا نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے کہ اس حد تک درست ہے اور اس حد سے باہر یہ عمل درست نہیں ہے۔

تصوف کیا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ آج تصوف نام ہو گیا اس بات کا کہ کسی پیر صاحب کے پاس چلے گئے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا، بیعت کر لی اور بیعت کرنے کے بعد انھوں نے کچھ وظیفے بتا دیئے کچھ اوراد سکھا دیئے کہ صبح کو یہ پڑھا کرو، شام کو یہ پڑھا کرو اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔ اب نہ باطن کی فکر، نہ اخلاق کے درست کرنے کا اہتمام، نہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کرنے کا شوق، نہ اخلاق رذیلہ کو ختم کرنے کی فکر۔ یہ سب کچھ نہیں بس بیٹھے ہوئے وظیفے پڑھ رہے ہیں اور بعض اوقات یہ وظیفے پڑھنا ان بیماریوں کے اندر اور زیادہ شدت پیدا کر دیتا ہے۔

وظائف و معمولات کی حقیقت

ان وظائف، اذکار، معمولات کی مثال ایسی ہے جیسے مقویات۔ اور مقویات کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے اندر بیماری موجود ہے اور بیماری کی حالت میں وہ مقویات کھاتا رہے تو بسا اوقات نہ صرف یہ کہ اس کو قوت حاصل نہیں ہوتی بلکہ بیماری کو قوت حاصل ہوتی ہے، بیماری بڑھ جاتی ہے اگر دل میں تکبر بھرا ہوا ہے عجب بھرا ہوا ہے اور بیٹھ کر وظیفے گھونٹ رہا ہے اور ذکر بہت کر رہا ہے تو بعض اوقات اس کے نتیجے میں اصلاح ہونے

کے بجائے تکبر اور بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ جو بتایا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وظیفہ کرو یا ذکر کرو کسی شیخ کی رہنمائی میں کرو اس لئے کہ شیخ جانتا ہے کہ اس سے زیادہ اگر بتاؤں گا تو وہ اس کے اندر بیماری پیدا کرے گا۔ اس واسطے وہ اس کو روک دیتا ہے کہ بس، اب مزید ذکر کی ضرورت نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کتنے آدمیوں کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تمام وظائف واذ کار ترک کر دیں، حضرتؒ نے ان کے تمام معمولات چھڑوا دیئے، خاص حالات میں جب دیکھا کہ اس کے لئے یہ وظیفہ مضر ثابت ہو رہا ہے تو وہ چھڑوا دیا۔

مجاہدات کا اصل مقصد

لیکن آج کل تصوف کا اور پیری مریدی کا سارا زور اس پر ہے کہ معمولات بتا دئے گئے کہ فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے۔ بس، وہ محض ذکر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، چاہے باطن کے اندر کتنی ہی بیماریاں جوش مار رہی ہوں۔ پہلے زمانے میں صوفیائے کرام کے ہاں معمول تھا کہ کسی شخص کی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہوتا تھا کہ اس کے اخلاق کی اصلاح کرنے کی فکر کرتے اس کے لئے مجاہدات کروائے جاتے تھے، ریاضتیں ہوتی تھیں، رگڑا جاتا تھا، تب جاکر اندر کی اصلاح ہوتی تھی اور اس کے بعد انسان کسی قابل ہوتا تھا۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ گنگوہ کے بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے شجرے کے اندر ان کا اعلیٰ درجے کا واسطہ ہے۔ ان کے ایک پوتے تھے۔ جب تک شیخ حیات تھے، پوتے کو فکر نہ ہوئی ساری دنیا آکر دادا سے فیض حاصل کرتی رہی لیکن وہ صاحب زادگی کی موج میں رہے اور دادا کی طرف اس نقطہ نظر سے رجوع نہ کیا کہ اپنی اصلاح کرائیں جب شیخ کا انتقال ہو گیا تب ان کو حسرت ہوئی کہ یا اللہ! میں کتنا محروم رہ گیا۔ کہاں کہاں سے آکر ساری دنیا فیض اٹھا گئی، اور میں گھر

میں ہوتے ہوئے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا، اور چراغ تلے اندھیرا۔ اب حسرت ہوئی تو سوچا کہ کیا کروں، تلافی کیسے ہو، خیال آیا کہ میرے دادا سے جن لوگوں نے اصلاح نفس کی یہ دولت حاصل کی ہے ان میں سے کسی کی طرف رجوع کروں۔ معلوم کیا کہ میرے دادا کے خلفاء میں سے کون اونچے مقام کا بزرگ ہے۔ معلوم ہوا کہ بلخ میں ایک اونچے مقام کے بزرگ ہیں، اب کہاں گنگوہ، کہاں بلخ۔ کہاں تو یہ کہ گھر میں دولت موجود تھی اور ہر وقت ان سے رجوع کر سکتے تھے وہ نہ کیا۔ آخر کار اس کی نوبت آئی کہ بلخ تک اتنا لمبا چوڑا مشقت کا سفر کریں اب چونکہ طلب صادق تھی اس لئے سفر پر روانہ ہو گئے۔

شیخ کے پوتے کا استقبال

ادھر جب شیخ کے خلیفہ کو جو بلخ میں مقیم تھے معلوم ہوا کہ میرے شیخ کے پوتے آ رہے ہیں تو اپنے شہر سے باہر نکل کر انہوں نے بڑا شاہانہ استقبال کیا۔ اکرام کے ساتھ گھر لے کر آئے شاندار کھانے پکوائے، اعلیٰ درجے کی دعوت کی، بہت اعلیٰ درجے کی رہائش کا انتظام کیا قالین بچھوائے اور خدا جانے کیا کچھ کیا۔

حمام کی آگ روشن کیجئے

جب ایک دو دن گزر گئے تو انہوں نے کہا کہ حضرت آپ نے میرے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ کیا، بڑا اکرام فرمایا، لیکن در حقیقت میں کسی اور مقصد سے آیا تھا۔ پوچھا کیا مقصد؟ کہا کہ مقصد یہ تھا کہ آپ میرے گھر سے جو دولت لے کر آئے تھے اس دولت کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرما دیں۔ اس لئے حاضر ہوا تھا۔ شیخ نے کہا "اچھا! وہ دولت لینے آئے ہو؟" کہا کہ "جی ہاں!" کہا کہ "اگر وہ دولت لینے آئے ہو تو یہ غالیچے، یہ قالین، یہ اعزاز و اکرام، یہ کھانے پینے کا انتظام، سب ختم کر دیا جائے، رہائش کا انتظام جو اعلیٰ درجے کا کیا گیا تھا وہ بھی ختم کر دیا جائے۔" انہوں نے پوچھا کہ "اب کیا کروں؟" فرمایا "ہماری مسجد کے پاس ایک حمام ہے اس میں وضو کرنے والوں کے لئے لکڑیاں جلا کر پانی گرم کیا جاتا ہے۔ تم وہاں حمام کے پاس بیٹھا کرو اور

لکڑیاں جھونک کر وضو کرنے والوں کے لئے پانی گرم کیا کرو۔ بس تمہارا یہی کام ہے۔ " نہ بیعت، نہ وظیفہ، نہ ذکر، نہ معمولات، نہ کچھ اور۔ انہوں نے پوچھا "رہائش کہاں؟" فرمایا "رات کو جب سونا ہو تو وہیں حمام کے پاس سو جایا کرو۔ " کہاں تو یہ اعزاز و اکرام استقبال ہو رہا ہے قالین بچھ رہے ہیں کھانے پک رہے ہیں دعوتیں ہو رہی ہیں اور کہاں اب حمام جھونکنے پر لگا دیئے گئے اب حمام میں بیٹھے ہیں اور آگ میں لکڑیاں جھونک رہے ہیں۔

ابھی کسر باقی ہے

لکڑیاں جھونکتے جھونکتے شیخ نے ایک دن جمعدارنی کو ہدایت کی کہ ایسا کرنا کہ حمام کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہو گا یہ کچرے کا ٹوکرا لے کر اس کے قریب سے گزر جانا اور اس طرح گزرنا کہ اس ٹوکرے کی بو ان کی ناک میں پہنچ جائے " اب وہ ٹوکرا لے کر حمام کے پاس سے جو گزری تو چونکہ یہ تو صاحب زادے تھے، نواب زادگی کی زندگی گزاری تھی۔ ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی اور کہا "تیری یہ مجال کہ تو یہ ٹوکرا لے کر میرے پاس سے گزرے، نہ ہوا گنگوہ، ورنہ میں تجھے بتاتا" ۔ شیخ نے جمعدارنی کو بلا کر پوچھا کہ جب تو ٹوکرا لے کر گزری تو کیا ہوا؟ " اس نے کہا کہ "جی وہ تو بہت غصے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ گنگوہ ہوتا تو تجھے بہت سخت سزا دیتا۔ " کہا کہ "اوہو! ابھی بہت کسر ہے۔ ابھی چاول گلا نہیں" ۔

پھر کچھ دن گزرے تو شیخ نے جمعدارنی سے کہا کہ "اب کے نہ صرف وہ ٹوکرا لے کر ان کے قریب سے گزرنا بلکہ اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا ان کے جسم سے لگ جائے اور پھر مجھے بتانا کہ کیا ہوا۔ " اس نے یہی کیا۔ شیخ نے پوچھا کہ "کیا ہوا؟" اس نے کہا کہ "جی ہوا یہ کہ جب میں ٹوکرا لے کر گزری اور ٹوکرا بالکل ان کے جسم سے رگڑ کھاتا ہوا گزرا تو انھوں نے نہایت ترش نگاہ سے میری طرف دیکھا، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ " شیخ نے کہا "الحمد اللہ" فائدہ ہو رہا ہے"

اب دل کا طاغوت ٹوٹ گیا

پھر کچھ دن بعد شیخ نے کہا کہ "ابّ کے اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا گر جائے اور اس طرح گرے کہ تھوڑا سا کچرا ان کے اوپر بھی پڑ جائے اور پھر مجھے بتا دینا کہ انہوں نے کیا کہا" اس نے ایسا ہی کیا، شیخ نے پوچھا کہ "اب کیسا ہوا؟" اس نے کہا "جی! اب تو عجیب معاملہ ہوا۔ میں نے جو ٹوکرا گرایا تو تھوڑا ساکوڑا ان کے اوپر بھی پڑا اور میں بھی گر گئی۔ میں جو گری تو ان کو اپنے کپڑوں کا تو ہوش نہیں تھا، مجھ سے پوچھنے لگے کہ چوٹ تو نہیں لگی؟" فرمایا کہ "الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دل میں جو طاغوت تھا، وہ ٹوٹ گیا۔"

زنجیر مت چھوڑنا

اب ان کو بلا کر ڈیوٹی بدل دی۔ کہا کہ "اب تمہارا وہ حمام کا کام ختم۔ اب تم ہمارے ساتھ رہا کرو۔ وہ اس طرح کہ ہم کبھی کبھی شکار کے لئے جاتے ہیں تو تم ہمارے شکاری کتوں کی زنجیر پکڑ کر ہمارے ساتھ چلا کرو۔" اب ذرا اونچا درجہ عطا ہوا کہ شیخ کے ساتھ صحبت اور ہم رکابی کا شرف بھی عطا ہو رہا ہے، لیکن کتے کی زنجیر تھام کر ساتھ چلنے کا حکم ہے۔ شکار کے دوران کتوں نے کوئی شکار دیکھ لیا اور اس کی طرف جو دوڑے تو چونکہ شیخ کا حکم تھا کہ زنجیر نہ چھوڑنا اس لئے انہوں نے زنجیر نہیں چھوڑی۔ کتے تیز بھاگے جا رہے ہیں اور یہ زنجیر چھوڑتے نہیں۔ اسی حالت میں زمین پر گر گئے اور کتوں کے پیچھے زمین پر گھسٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں جسم پر کئی زخم لگ گئے اور لہولہان ہو گئے۔

وہ دولت آپ کے حوالے کر دی

رات کو شیخ نے اپنے شیخ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کو خواب میں دیکھا انہوں نے فرمایا کہ "میاں! ہم نے تو تم سے ایسی محنتیں نہیں لی تھیں۔" اس وقت ان کو تنبیہ ہوئی بلایا، اور بلا کر گلے سے لگایا اور فرمایا "آپ جو دولت لینے آئے تھے اور جو دولت آپ کے گھر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی تھی۔ الحمدللہ میں نے وہ ساری دولت آپ کے حوالے کر دی۔ دادا کی وراثت آپ کی طرف منتقل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل

و کرم سے اب آپ اطمینان سے وطن واپس تشریف لے جائیں۔ "

اصلاح کا اصل مقصد

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرات صوفیائے کرام کا اصل کام اندر کی بیماریوں کا علاج تھا۔ محض وظیفے، ذکر، تسبیح، معمولات نہیں تھیں۔ یہ ذکر، وظیفے، تسبیح معمولات، یہ سب بطور مقویات کے ہیں۔ یہ اصلاح کے عمل میں معاونت کرنے کے لئے کروائے جاتے تھے لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ باطن کی بیماریاں دور ہوں۔ تکبر دل سے نکلے، حسد دل سے نکلے، بغض دل سے نکلے، عجب دل سے نکلے، منافقت دل سے نکلے، دکھاوے کا شوق دل سے نکلے، حب جاہ دل سے نکلے، حب دنیا دل سے نکلے، قلب کو ان چیزوں سے صاف کرنا اصل مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو، اللہ تعالیٰ سے امید وابستہ ہو، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، توکل ہو، استقامت ہو، اخلاص ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے تواضع ہو، یہ چیزیں پیدا کرنا تصوف کا اصل مقصود ہے۔

اصلاح باطن ضروری کیوں؟

لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف شریعت سے کوئی الگ چیز ہے۔ خوب سمجھ لو کہ یہ شریعت ہی کا ایک حصہ ہے۔ شریعت، انسان کے ظاہری اعمال و افعال سے متعلق جتنے احکام ہیں ان کے مجموعے کا نام ہے اور طریقت یا تصوف باطن کے اعمال و افعال سے متعلق احکام کے مجموعے کا نام ہے اور باطن کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے اگر یہ درست نہ ہو تو ظاہری اعمال بھی بیکار ہو جاتے ہیں۔ فرض کرو کہ اخلاص نہیں ہے۔ اخلاص کے کیا معنیٰ ہیں؟ اخلاص کے معنی یہ ہیں ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی فکر کہ انسان جو کام بھی کرے، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کرے۔ یہ ہے اخلاص۔ یہ اخلاص ایک باطنی فعل ہے۔ ایک شخص کو اخلاص حاصل نہیں ہے تو اگر وہ نماز بغیر اخلاص کے پڑھ رہا ہے اور اس لئے پڑھ رہا ہے کہ لوگ مجھے متقی، پرہیزگار سمجھیں، عبادت گزار سمجھیں۔ اب ظاہری اعمال تو درست ہیں، لیکن چونکہ باطن میں اخلاص کی روح نہیں ہے اس واسطے وہ ظاہری اعمال بیکار ہیں، بے مصرف ہیں، گناہ ہیں، کیونکہ

حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من صلی یرائی فقد اشرک باللہ

(مشکوٰۃ کتاب الرقاق باب الریاء والسمعۃ حدیث نمبر ۵۳۳۱)

یعنی جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے"

گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو شریک ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ کے بجائے مخلوق کو راضی کرنا چاہتا ہے اس لئے باطن کی اصلاح ظاہری اعمال کو درست کرنے کے لئے بھی لازمی ہے اگر یہ نہیں ہوگی تو ظاہری اعمال بھی بیکار ہو جائیں گے۔

اپنا معالج تلاش کیجئے

ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ بتلایا کہ چونکہ انسان ان چیزوں کی اصلاح خود نہیں کر سکتا، لہٰذا کوئی معالج تلاش کرنا چاہئے۔ اس معالج کو چاہئے پیر کہہ لو، چاہے شیخ کہہ لو، چاہے استاد کہہ لو، لیکن اصل میں وہ معالج ہے، باطن کی بیماریوں کا ڈاکٹر ہے۔ جب تک انسان یہ نہیں کریگا، اس وقت تک اسی طرح بیماریوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اعمال خراب ہوتے چلے جائیں گے۔

جو باب آگے شروع ہو رہا ہے یہ اس کا تھوڑا سا تعارف تھا۔ اب آگے اخلاق کے جتنے شعبے ہیں، ایک ایک کا بیان اس میں آئے گا کہ اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور برے اخلاق کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دنیا سے دل نہ لگاؤ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم
ضبط و ترتیب : محمد عبد اللہ میمن
تاریخ و وقت : ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء بروز جمعہ بعد نماز عصر
مقام : جامع مسجد بیت المکرم۔ گلشن اقبال کراچی

دنیا کے یہ اسباب، یہ ساز و سامان جب تک تمہارے چاروں طرف ہیں تو پھر کوئی ڈر نہیں، اس لئے کہ یہ ساز سامان تمہاری زندگی کی کشتی کو چلائیں گے، لیکن جس دن دنیا کا یہ ساز و سامان تمہارے ارد گرد سے ہٹ کر تمہارے دل کی کشتی میں داخل ہوگیا، اس دن یہ تمہیں ڈبو دے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا سے دل نہ لگاؤ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً۔ اما بعد:

اما بعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یَاۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ
(سورۃ الفاطر: ۵)

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم۔ ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین۔

دنیا کی راحت دین پر موقوف ہے

ہر مسلمان کے لئے اخلاق باطنہ کی تحصیل ضروری ہے جن کے حاصل کئے بغیر نہ دین درست ہو سکتا ہے۔ اور نہ دنیا درست ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حقیقت میں دنیا کی درستگی بھی دین کی درستگی پر موقوف ہے، یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ دین کے بغیر بھی دنیا اچھی پر سکون اور راحت و آرام والی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے اسباب و وسائل کا حاصل ہو جانا اور بات ہے۔ اور دنیا میں پر سکون زندگی، اطمینان، راحت و آرام اور مسرت کی زندگی حاصل ہو جانا اور بات ہے۔ دنیا کے وسائل و اسباب تو دین کو چھوڑ کر حاصل ہو

جائیں گے، پیسوں کا ڈھیر لگ جائے گا، بنگلے کھڑے ہو جائیں گے۔ کارخانے قائم ہو جائیں گے۔ کاریں حاصل ہو جائیں گی، لیکن جس کو "دل کا سکون" کہا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ دین کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے دنیا کی حقیقی راحت بھی انہی اللہ والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنی زندگی کو اللہ جل شانہ کے احکام کے تابع بناتے ہیں۔ اس لئے جب تک ان اخلاق کی اصلاح نہ ہو، نہ دین درست ہو سکتا ہے۔ اور نہ دنیا درست ہو سکتی ہے۔ ان اخلاق میں سے دو کا بیان پچھلے جمعہ ہو چکا، ایک خوف اور ایک رجا (امید) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

"زھد" کی حقیقت

آج بھی ایک بہت بنیادی اخلاق کا بیان ہے۔ جس کو "زھد" کہا جاتا ہے۔ آپ حضرات نے یہ لفظ بہت سنا ہو گا کہ فلاں شخص بڑا عابد اور زاھد ہے۔ زاھد اس شخص کو کہتے ہیں جس میں "زھد" ہو، اور "زھد" ایک باطنی اخلاق ہے۔ جسے ہر مسلمان کو حاصل کرنا ضروری ہے، اور "زھد" کے معنی ہیں۔ "دنیا سے بے رغبتی" اور "دنیا کی محبت سے دل کا خالی ہونا" دل دنیا میں اٹکا ہوا نہ ہو، اس کی محبت اس طرح دل میں پیوست نہ ہو کہ ہر وقت اسی کا دھیان اور اسی کا خیال اسی کی فکر ہے اور اسی کے لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے اس کا نام "زھد" ہے۔

گناہوں کی جڑ "دنیا کی محبت"

ہر مسلمان کو اس کا حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر دنیا کی محبت دل میں سمائی ہوئی ہو تو پھر صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں نہیں آ سکتی اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہوتی وہ محبت غلط رخ پر چل پڑتی ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

حب الدنیا راس کل خطیئة

"دنیا کی محبت ہر گناہ اور معصیت کی جڑ ہے"

(کنز العمال: حدیث نمبر ۶۱۱۴)

جتنے جرائم اور گناہ ہیں اگر انسان ان کی حقیقت میں غور کرے گا تو اس کو یہی نظر آئے گا کہ ان سب میں دنیا کی محبت کار فرما ہے۔ چور کیوں چوری کر رہا ہے؟ اس لئے کہ دنیا کی محبت ہے، اگر کوئی شخص بدکاری کر رہا ہے، تو کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے کہ دنیا کی لذتوں کی محبت دل میں جمی ہوئی ہے۔ شرابی اس لئے شراب نوشی کر رہا ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کسی بھی گناہ کو لے لیجئے۔ اس کے پیچھے دنیا کی محبت کار فرما نظر آئے گی۔ اور جب دنیا کی محبت دل میں سمائی ہوئی ہے تو پھر اللہ کی محبت کیسے داخل ہو سکتی ہے۔

میں ابو بکر کو اپنا محبوب بناتا

یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں حقیقی محبت تو صرف ایک ہی کی سما سکتی ہے۔ ضرورت کے وقت تعلقات تو بہت سے لوگوں سے قائم ہو جائیں گے۔ لیکن حقیقی محبت ایک ہی کی سما سکتی ہے۔ جب ایک کی محبت آگئی تو پھر دوسرے کی محبت اس درجے میں نہیں آسکے گی۔ اس واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ:

لوكنت متخذا خليلاً لتخذت ابابكرخليلاً

(صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ باب الخوخۃ والممر فی المسجد، حدیث نمبر ۴۶۶)

اگر میں اس دنیا میں کسی کو اپنا محبوب بناتا تو "ابو بکر" (رضی اللہ عنہ) کو بناتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ علیہ سے اس درجہ تعلق تھا کہ دنیا میں ایسا تعلق کسی اور سے نہیں ہوا، یہاں تک کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مثال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی ہے، جیسے کہ ایک آئینہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا جائے۔ اور اس آئینے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس نظر آئے، اور پھر کہا جائے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آئینے میں جو عکس ہے وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقام تھا...... لیکن اس کے باوجود آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کو اپنا محبوب بناتا ہوں، بلکہ یہ فرمایا کہ اگر میں کسی کو اپنا

محبوب بناتا تو ان کو بناتا، لیکن میرے محبوب حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں، اور جب وہ محبوب بن گئے تو دوسرے کے ساتھ حقیقی محبت کے لئے دل میں جگہ نہ رہی۔ البتہ تعلقات دوسروں سے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ہوتے بھی ہیں، مثلاً بیوی سے تعلق، بچوں سے تعلق، ماں سے تعلق، باپ سے تعلق، بھائی سے تعلق، بہن سے تعلق، مگر یہ تعلقات اس محبت کے تابع ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت دل میں ہوتی ہے۔

دل میں صرف ایک کی محبت سما سکتی ہے

لہٰذا دل میں حقیقی محبت یا تو اللہ تعالیٰ کی ہوگی، یا دنیا کی ہوگی دونوں محبتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی وجہ سے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں

ایں خیال است و محال است و جنوں

یعنی دنیا کی محبت بھی دل میں سمائی ہوئی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بھی سمائی ہوئی ہو، یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ یہ صرف خیال ہے اور محال ہے اور جنون ہے، اس واسطے اگر دل میں دنیا کی محبت سما گئی تو پھر اللہ کی محبت نہیں آئے گی۔ جب اللہ کی محبت نہیں ہوگی تو پھر دین کے جتنے کام ہیں، وہ سب محبت کے بغیر بے روح ہیں، بے حقیقت ہیں، ان کے ادا کرنے میں پریشانی و دشواری اور مشقت ہوگی اور صحیح معنی میں وہ دین کے کام انجام نہیں پا سکیں گے۔ بلکہ قدم قدم پر آدمی ٹھوکریں کھائے گا، اس لئے کہا گیا کہ انسان دل میں دنیا کی محبت کو جگہ نہ دے۔ اسی کا نام "زھد" ہے اور "زھد" کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

لیکن یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کہ دنیا کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہے، دنیا کے اندر ہی رہنا ہے جب بھوک لگتی ہے کہ تو کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور جب پیاس لگتی ہے تو پانی کی ضرورت پیش آتی ہے سر چھپانے اور رہنے

کے لئے گھر کی بھی ضرورت ہے کسب معاش کی بھی ضرورت ہے، لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب یہ سب کام بھی انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان دنیا کے اندر بھی رہے، اور دنیا کی ضروریات بھی پوری کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دل میں دنیا نہ آئے، دل میں دنیا سے بے رغبتی پائی جائے۔ ان دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا مشکل نظر آتا ہے، یہی وہ کام ہے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین آکر سکھاتے ہیں کہ کس طرح تم دنیا میں رہو، اور دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہ دو، ایک حقیقی مسلمان دنیا کے اندر بھی رہے گا، دنیا والوں سے تعلق بھی قائم کرے گا۔ حقوق بھی ادا کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی محبت سے بھی پرہیز کرے گا حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ۔

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی دنیا میں رہے، دنیا سے گزرے، دنیا کو برتے، لیکن دنیا کی محبت دل میں نہ آئے؟

دنیا کی مثال

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے اور بڑی پیاری مثال دی ہے، فرماتے ہیں کہ دنیا کے بغیر انسان کا گزارہ بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے بے شمار ضرورتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، اور دنیا کی مثال پانی جیسی ہے جیسے پانی کے بغیر کشتی نہیں چل سکتی، اس لئے کہ اگر کوئی شخص خشکی پر کشتی چلانا چاہے تو نہیں چلے گی، اسی طرح انسان کو زندہ رہنے کے لئے دنیا ضروری ہے، انسان کو زندہ رہنے کے لئے پیسہ چاہئے، کھانا چاہئے، پانی چاہئے، مکان چاہئے، کپڑا چاہئے، اور ان سب چیزوں کی اس کو ضرورت ہے، اور یہ سب چیزیں دنیا ہیں...... لیکن جس طرح پانی کشتی کے لئے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک کہ وہ پانی کشتی کے نیچے ہے اور اس کے دائیں طرف اور بائیں طرف ہے اس کے آگے اور پیچھے ہے وہ پانی اس کشتی کو چلائے گا۔ لیکن اگر وہ پانی دائیں بائیں

کے بجائے کشتی کے اندر داخل ہو گیا تو وہ کشتی کو ڈبو دے گا، تباہ کر دے گا۔

اسی طرح دنیا کا یہ اسباب اور دنیا کا یہ ساز و سامان جب تک تمہارے چاروں طرف ہے تو پھر کوئی ڈر نہیں ہے اس لئے کہ یہ ساز و سامان تمہاری زندگی کی کشتی کو چلائے گا۔ لیکن جس دن دنیا کا یہ ساز و سامان تمہارے اردگرد سے ہٹ کر تمہارے دل کی کشتی میں داخل ہو گیا، اس دن تمہیں ڈبو دے گا، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

یعنی جب تک پانی کشتی کے اردگرد ہو تو وہ کشتی کو چلاتا ہے، اور دھکا دیتا ہے، لیکن وہ اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو وہ کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔

دو محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

لہٰذا "زہد" اسی کا نام ہے کہ یہ دنیا تمہارے چاروں طرف اور اردگرد رہے، لیکن اس کی محبت تمہارے دل میں داخل نہ ہو، اس لئے کہ اگر دنیا کی محبت دل میں داخل ہو گئی تو پھر اللہ کی محبت کے لئے دل میں جگہ نہیں چھوڑے گی، اور اللہ کی محبت دنیا کی محبت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، غالباً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ شعر منسوب فرماتے تھے وہ انہی کے مقام کا شعر ہے، فرماتے کہ ؎

بھر رہا ہے دل میں حب جاہ و مال
کب سماوے اس میں حب ذوالجلال

یعنی جب مال و جاہ اور منصب کی محبت دل میں بھری ہوئی ہے تو پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے سما سکتی ہے اس لئے حکم یہ ہے کہ اس دنیا کی محبت کو دل سے نکال دو، دنیا کو نکالنا ضروری نہیں، دنیا کو ترک کرنا ضروری نہیں، لیکن دنیا کی محبت نکالنا ضروری ہے، اگر دنیا ہو، لیکن بغیر محبت کی ہو تو وہ دنیا نقصان دہ نہیں ہے۔

دنیا کی مثال "بیت الخلاء" ہے

عام طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو انسان اس دنیا کو ضروری بھی سمجھے، اور اس کی اہمیت بھی ہو، لیکن دل میں اس کی محبت نہ ہو، اس بات کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ آپ جب ایک مکان بناتے ہیں، تو اس مکان کے مختلف حصے ہوتے ہیں ایک سونے کا کمرہ ہوتا ہے، ایک ملاقات کا کمرہ ہوتا ہے ایک کھانے کا کمرہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اور اسی مکان میں آپ ایک بیت الخلاء بھی بناتے ہیں اور بیت الخلاء کے بغیر وہ مکان نامکمل ہے، اگر ایک مکان بڑا شاندار بنا ہوا ہے کمرے اچھے ہیں بیڈ روم بڑا اچھا ہے، ڈرائنگ روم بہت اعلیٰ ہے کھانے کا کمرہ اچھا ہے اور پورے گھر میں بڑا شاندار اور قیمتی قسم کا فرنیچر لگا ہوا ہے۔ مگر اس میں بیت الخلاء نہیں ہے، بتایئے: کہ وہ مکان مکمل ہے یا ادھورا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ مکان ناقص ہے، اس لئے کہ بیت الخلاء کے بغیر کوئی مکان مکمل نہیں ہو سکتا، لیکن یہ بتایئے کہ کیا کوئی انسان ایسا ہو گا، کہ اس کا دل بیت الخلاء سے اس طرح اٹکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے دماغ میں یہی خیال رہے کہ کب میں بیت الخلاء جاؤں گا، اور کب اس میں بیٹھوں گا اور کس طرح بیٹھوں گا۔ اور کتنی دیر بیٹھوں گا، اور کب واپس نکلوں گا، ہر وقت اس کے دل و دماغ پر بیت الخلاء چھایا ہوا ہو، ظاہر ہے کہ کوئی انسان بھی بیت الخلاء کو اپنے دل و دماغ پر اس طرح سوار نہیں کرے گا اور کبھی اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے گا۔ اگرچہ وہ جانتا ہے کہ بیت الخلاء ضروری چیز ہے اس کے بغیر چارہ کار نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کے بارے میں ہر وقت یہ نہیں سوچے گا کہ میں بیت الخلاء کو کس طرح آراستہ کروں۔ اور آرام دہ بناؤں، اس لئے کہ اس بیت لخلاء کی محبت دل میں نہیں ہے۔

دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے

دین کی تعلیم بھی در حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے مال و اسباب کا بھی یہ حال ہے کہ وہ سب ضروری تو ہیں، اور ایسے ہی ضروری ہیں جیسے بیت الخلاء ضروری ہوتا ہے لیکن اس کی فکر، اس کی محبت، اس کا خیال دل و دماغ پر سوار نہ ہو جائے، بس دنیا کی حقیقت یہ ہے، اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ اس بات کا استحضار بار بار کرے کہ

اس دنیا کی حقیقت کیا ہے، یہ آیت جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ جل شانہ نے فرمایا:

"يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ہ" (سورۃ الفاطر:۵)

اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے، کیا وعدہ ہے؟ وہ وعدہ یہ ہے کہ ایک دن مرو گے، اور اس کے سامنے پیشی ہوگی، اور پھر تمام اعمال کا جواب دینا ہوگا، لہٰذا دنیاوی زندگی تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے، اور وہ دھوکے باز یعنی شیطان تمہیں اللہ سے دھوکے میں نہ ڈالے ...... شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں رہو، مگر اس سے دھوکہ نہ کھاؤ، اس لئے کہ یہ دار الامتحان ہے، جس میں بہت سے مناظر ایسے ہیں جو انسان کا دل لبھاتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اس لئے ان دل لبھانے والے مناظر کی محبت کو خاطر میں نہ لاؤ، اگر دنیا کا ساز و سامان جمع ہو بھی گیا تو کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ دل اس کے ساتھ اٹکا ہوا نہ ہو۔

شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کچھ لطیف قوتیں ان کے پاس بھیج دیتے ہیں، اور ان لطیف قوتوں کے بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کو دنیا کی محبت سے نکال کر اپنی محبت کی طرف بلایا جائے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا واقعہ میں نے اپنے والد ماجد (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) قدس اللہ سرہ سے سنا، فرمایا کہ شیخ فرید الدین عطار یونانی دواؤں اور عطر کے بہت بڑے تاجر تھے، اور اسی وجہ سے ان کو "عطار" کہا جاتا ہے دواؤں اور عطر کی بہت بڑی دکان تھی۔ کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا، اور اس وقت وہ ایک عام قسم کے دنیا دار تاجر تھے، ایک دن دکان پر بیٹھے ہوئے تھے، اور دوکان دواؤں اور عطر کی شیشیوں سے بھری ہوئی تھی، اتنے میں ایک مجذوب قسم کا درویش اور ملنگ آدمی دکان پر آگیا۔ اور دکان میں داخل ہو گیا، اور کھڑا ہو کر

پوری دکان میں کبھی اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتا، اور کبھی دائیں سے بائیں طرف دیکھتا، اور دواؤں کا معائنہ کرتا رہا۔ کبھی ایک شیشی کو دیکھتا، کبھی دوسری شیشی کو دیکھتا۔ جب کافی دیر اس طرح دیکھتے ہوئے گزر گئی تو شیخ فرید الدین نے اس سے پوچھا کہ تم کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا چیز تلاش کر رہے ہو؟ اس درویش نے جواب دیا کہ بس ویسے ہی یہ شیشیاں دیکھ رہا ہوں، شیخ فرید الدین نے پوچھا کہ تمہیں کچھ خریدنا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے کچھ خریدنا تو نہیں ہے۔ بس ویسے ہی دیکھ رہا ہوں، اور پھر ادھر ادھر الماری میں رکھی شیشیوں کی طرف نظر دوڑاتا رہا، بار بار دیکھتا رہا۔ پھر شیخ فرید الدین نے پوچھا کہ بھائی! آخر تم کیا دیکھ رہے ہو؟ اس درویش نے کہا کہ میں اصل میں یہ دیکھ رہا ہوں جب آپ مریں گے تو آپ کی جان کیسے نکلے گی؟ اس لئے کہ آپ نے یہاں اتنی ساری شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ جب آپ مرنے لگیں گے اور آپ کی روح نکلنے لگے گی تو اس وقت آپ کی روح کبھی ایک شیشی میں داخل ہو جائے گی کبھی دوسری شیشی میں داخل ہو جائے گی۔ اور اس کو باہر نکلنے کا راستہ کیسے ملے گا؟

اب ظاہر ہے کہ شیخ فرید الدین عطار اس وقت چونکہ ایک دنیا دار تاجر تھے، یہ باتیں سن کر غصہ آگیا۔ اور اس سے کہا کہ تو میری جان کی فکر کر رہا ہے۔ تیری جان کیسے نکلے گی؟ جیسے تیری جان نکلے گی۔ ویسے میری بھی نکل جائے گی۔ اس درویش نے جواب دیا کہ میری جان نکلنے میں کیا پریشانی ہے۔ اس لئے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے نہ میرے پاس تجارت ہے نہ دوکان ہے اور نہ شیشیاں ہیں۔ نہ ساز و سامان ہے میری جان تو اس طرح نکلے گی .... بس اتنا کہ کر وہ درویش دوکان کے باہر نیچے زمین پر لیٹ گیا اور کلمہ شہادت، "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا رسول الله" کہا، اور روح پرواز کر گئی۔

بس! یہ واقعہ دیکھنا تھا کہ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ واقعتاً میں تو دن رات اسی دنیا کے کاروبار میں منہمک ہوں، اور اسی میں لگا ہوا ہوں، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف دھیان نہیں ہے، اور یہ ایک اللہ کا بندہ سبک سیر طریقے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چلا گیا۔ بہر حال، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ایک لطیفہ غیبی تھا، جو ان کی ہدایت کا سبب بن گیا، بس! اسی دن اپنا سب کاروبار چھوڑ کر دوسروں کے حوالے کیا، اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، اور اسی راستے پر لگ کر اتنے بڑے شیخ بن گئے کہ دنیا کی ہدایت کا سامان بن گئے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ایک علاقے کے بادشاہ تھے رات کو دیکھا کہ ان کے محل کی چھت پر ایک آدمی ٹہل رہا ہے۔ یہ سمجھے کہ شاید یہ کوئی چور ہے۔ اور چوری کی نیت سے یہاں آیا ہے، پکڑ کر اس سے پوچھا کہ تم اس وقت یہاں کہاں سے آگئے؟ کیا کر رہے ہو؟ وہ شخص کہنے لگا کہ اصل میں میرا ایک اونٹ گم ہوگیا ہے اونٹ تلاش کر رہا ہوں، حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ تمہارا دماغ صحیح ہے؟ اونٹ کہاں۔ اور محل کی چھت کہاں، اگر تیرا اونٹ گم ہوگیا ہے تو پھر جنگل میں جاکر تلاش کر، یہاں محل کی چھت پر اونٹ تلاش کرنا بڑی حماقت ہے تم احمق انسان ہو۔ اس آدمی نے کہا کہ اگر اس محل کی چھت پر اونٹ نہیں مل سکتا۔ تو پھر اس محل میں خدا بھی نہیں مل سکتا۔ اگر میں احمق ہوں تو تم مجھ سے زیادہ احمق ہو۔ اس لئے کہ اس محل میں رہ کر خدا کو تلاش کرنا اس سے بڑی حماقت ہے۔ بس اس کا یہ کہنا تھا کہ دل پر ایک چوٹ لگی، اور سب بادشاہت وغیرہ چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ بہر حال! یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطیفہ غیبی تھا۔

اس سے سبق حاصل کریں

ہم جیسے لوگوں کے لئے اس واقعہ سے یہ سبق لینا تو درست نہیں ہے کہ جس طرح وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے نکل پڑے۔ ہم بھی ان کی طرح نکل جائیں، ہم جیسے کم ظرف لوگوں کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں لیکن اس واقعہ سے جو بات سبق لینے کی ہے وہ یہ کہ اگر انسان کا دل دنیا کے ساز و سامان میں دنیا کے راحت و آرام میں اٹکا ہوا ہو۔ اور صبح سے شام تک دنیا حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہو۔ ایسے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آتی۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل

میں آجاتی ہے تو دنیا کا یہ ساز و سامان انسان کے پاس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن دل اس کے ساتھ اٹکا نہیں ہوتا۔

میرے والد ماجد اور دنیا کی محبت

میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین...... اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی ذات میں شریعت اور طریقت کے بے شمار نمونے دکھادیئے۔ اگر ہم ان کو نہ دیکھتے تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ سنت کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ انہوں نے دنیا میں رہ کر سب کام کیے، درس و تدریس انہوں کی۔ فتوے انہوں نے لکھے۔ تصنیف انہوں کی، وعظ و تبلیغ انہوں نے کی۔ پیری مریدی انہوں نے کی، اور ساتھ ساتھ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے عیالداری کے حقوق ادا کرنے کے لئے تجارت بھی کی، لیکن یہ سب ہوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ان کے دل میں دنیا کی محبت ایک رائی کے دانے کے برابر بھی داخل نہیں ہوئی۔

وہ باغ میرے دل سے نکل گیا

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کو چمن کاری کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ پاکستان بننے سے پہلے دیوبند ہی میں بڑے شوق سے ایک باغ لگایا، دارالعلوم دیوبند میں ملازمت کے دوران تنخواہ کم اور عیال زیادہ تھے۔ اس تنخواہ سے گزارہ بھی بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن تنخواہ سے بڑی مشکل سے کچھ انتظام کر کے آم کا باغ لگایا اور اس باغ میں پہلی مرتبہ پھل آرہا تھا، کہ اسی سال پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا اور آپ نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور اس باغ اور مکان پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا۔ بعد میں حضرت والد صاحب کی زبان سے اکثر یہ جملہ سنا کہ "جس دن میں نے اس گھر اور باغ سے قدم نکالا، اس دن سے وہ باغ اور گھر میرے دل سے نکل گئے، ایک مرتبہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں نے کیسا باغ لگایا تھا، اور کیسا گھر بنایا

تھا۔" وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ سارے کام ضرور کئے تھے۔ لیکن ان کا مقصد اداء حق تھا۔ اور دل ان کے ساتھ اٹکا ہوا نہیں تھا۔

دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے۔

ساری عمر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول دیکھا کہ جب کبھی کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں بلاوجہ آپ سے جھگڑا شروع کرتا تو والد صاحب اگرچہ حق پر ہوتے۔ لیکن ہمیشہ آپ کا یہ معمول دیکھا کہ آپ اس سے فرماتے کہ ارے بھائی جھگڑا چھوڑو، اور یہ چیز لے جاؤ۔ اپنا حق چھوڑ دیتے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا کرتے تھے کہ:

انا زعیم ببیت فی ربض الجنۃ لمن ترك المراء وان کان محقًا

(ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق، حدیث نمبر ۴۸۰۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس شخص کو جنت کے اطراف میں گھر دلانے کا ذمہ دار ہوں، جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے ...... حضرت والد صاحب کو ساری عمر اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے دیکھا...... بعض اوقات ہمیں یہ تردد ہوتا کہ آپ حق پر تھے۔ اگر اصرار کرتے تو حق مل بھی جاتا۔ لیکن آپ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا عطا فرمائی، اور ایسے لوگوں کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

اتتہ الدنیا وھی راغمۃ

(ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الھم بالدنیا، حدیث نمبر ۴۱۵۷)

یعنی جو شخص ایک مرتبہ اس دنیا کی طلب سے منہ پھیر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دنیا ذلیل کر کے لاتے ہیں۔ وہ دنیا اس کے پاؤں سے لگی پھرتی ہے، لیکن اس کے دل میں اس کی محبت نہیں ہوتی۔

دنیا مثل سائے کے ہے

کسی شخص نے دنیا کی بڑی اچھی مثال دی ہے، فرمایا کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کا سایا، اگر کوئی شخص چاہے کہ میں اپنے سائے کا تعاقب کروں، اور اس کو پکڑ لوں۔ تو نتیجہ یہ ہو گا وہ اپنے سائے کے پیچھے جتنا دوڑے گا۔ وہ سایہ اور آگے دوڑتا چلا جائے گا۔ کبھی اس کو پکڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اگر انسان اپنے سائے سے منہ موڑ کر اس کی مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دے تو پھر سایہ اس کے پیچھے پیچھے آئے گا...... اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بھی ایسا ہی بنایا ہے کہ اگر دنیا کے طالب بن کر اور اس کی محبت دل میں لے کر اس کے پیچھے بھاگو گے تو وہ دنیا تم سے آگے آگے بھاگے گی۔ تم کبھی اس کو پکڑ نہیں سکو گے۔ لیکن جس دن ایک مرتبہ تم نے اس کی طلب سے منہ موڑ لیا۔ تو پھر دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کس طرح ذلیل کر کے لاتے ہیں بے شمار مثالیں ایسی ہوئی ہیں کہ دنیا اس کے پاس آتی ہے۔ اور وہ اسکو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ لیکن پھر وہ دنیا پھر بھی پاؤں میں پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایک مرتبہ سچے دل سے اس دنیا کی طلب سے منہ موڑنا ضروری ہے۔ اور یہ بات دنیا کی حقیقت سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دنیا کی حقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احادیث میں بیان فرما دی۔ ان احادیث کو پڑھ کر دنیا کی محبت دل سے نکالنے کی فکر کرنی چاہئے۔

بحرین سے مال کی آمد

عن عمرو بن عوف الانصاری رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ الی البحرین - الخ -

(صحیح بخاری، حدیث نمبر ۶۴۲۵)

حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا اور ان کو یہ کام بھی سپرد کیا کہ وہاں کے کفار اور مشرکین پر جو جزیہ اور ٹیکس واجب ہے وہ ان سے وصول کر کے لایا کریں، چنانچہ ایک مرتبہ یہ بحرین سے ٹیکس اور جزیہ کا مال لے کر مدینہ

طیبہ حاضر ہوئے، وہ مال نقدی کی شکل میں بھی ہوتا تھا، کپڑے کی شکل میں بھی ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ وہ جزیہ کا مال صحابہ کرام کے درمیان تقسیم فرما دیا کرتے تھے چنانچہ جب کچھ انصاری صحابہ کو پتہ چلا کہ حضرت عبیدہ بحرین سے مال لائے ہیں تو وہ انصاری صحابہ فجر کی نماز میں مسجد نبوی میں حاضر ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے فارغ ہو کر واپس گھر کی طرف تشریف لے جانے لگے تو وہ انصاری صحابہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ گئے، اور زبان سے کچھ نہیں کہا، سامنے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو مال بحرین سے آیا ہوا ہے وہ ہمارے درمیان تقسیم فرما دیں...... یہ وہ زمانہ تھا جس میں صحابہ کرام تنگ دستی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، کئی کئی وقتوں کے فاقے گزرتے تھے، پہننے کو کپڑا موجود نہیں تھا۔ انتہائی تنگی کا زمانہ تھا...... جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو دیکھا کہ اس طرح سامنے آ گئے ہیں تو آپ نے تبسم فرمایا، اور سمجھ گئے کہ یہ حضرات اس مال کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں...... پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میرے خیال میں تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ عبیدہ بن جراح بحرین سے کچھ سامان لے کر آئے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! یا رسول اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو ان سے یہ فرمایا کہ خوشخبری سن لو کہ تمہیں خوش کرنے والی چیز ملنے والی ہے، وہ مال تمہیں مل جائے گا۔

تم پر فقر و فاقے کا اندیشہ نہیں ہے

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس فرمایا کہ صحابہ کرام کا اس طرح آنا، اور اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کرنا، اور اس بات کا انتظار کرنا یہ مال ہمیں ملنے والا ہے، یہ عمل کہیں انکے دل میں دنیا کی محبت پیدا نہ کر دے، اس لئے آپ نے ان کو خوش خبری سنانے کے فوراً بعد فرما دیا کہ:

فواللہ ما الفقر اخشی علیکم، ولکنی اخشی ان تبسط الدنیا علیکم کما بسطت علی من کان قبلکم، فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلکم کما اھلکتھم۔

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس فیھا، رقم ۶۴۲۵)

خدا کی قسم، مجھے تمہارے اوپر فقر و فاقے کا اندیشہ نہیں ہے، یعنی اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ تمہارے اوپر فقر و فاقہ گزرے گا۔ اور تم تنگ عیشی کے اندر مبتلا ہو جاؤ گے، اور مشقت اور پریشانی ہوگی، اس لئے کہ اب تو ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ انشاء اللہ مسلمانوں میں کشادگی اور فراخی ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کے حصے کا سارا فقر و فاقہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جھیل گئے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین تین مہینے تک ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ اور اس وقت ہمارا کھانا صرف دو چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا، ایک کھجور اور ایک پانی۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر روٹی تناول نہیں فرمائی، گندم تو میسر ہی نہیں تھی۔ جو کی روٹی کا یہ حال تھا، لہذا فقر و فاقہ تو خود سرکار عالم صلی اللہ علیہ وسلم جھیل گئے۔

صحابہ کے زمانے میں تنگ عیشی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس زمانے ہمارا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے گھر میں چھینٹ کا کپڑا کہیں سے تحفے میں آگیا۔ یہ ایک خاص قسم کا نقش و نگار والا سوتی کپڑا تھا۔ اور کوئی بہت زیادہ قیمتی کپڑا نہیں تھا۔ لیکن پورے مدینہ منورہ میں جب بھی کسی کی شادی ہوتی، اور کسی عورت کو دلہن بنایا جاتا تو اس وقت میرے پاس یہ فرمائش آتی کہ وہ چھینٹ کا کپڑا عاریۃً ہمیں دے دیں۔ تاکہ ہم اپنی دلہن کو پہنائیں۔ چنانچہ شادیوں کے موقع پر وہ کپڑا دلہنوں کو پہنایا جاتا تھا...... بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ آج اس جیسے بہت سے کپڑے بازاروں میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اور وہی کپڑا آج اگر میں اپنی باندی کو بھی دیتی ہوں تو وہ بھی ناک منہ چڑھاتی ہے کہ میں تو یہ کپڑا نہیں پہنتی۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنی تنگ عیشی تھی اور اب کتنی فراوانی ہے۔

یہ دنیا تمہیں ہلاک نہ کر دے

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آئندہ زمانے میں اولاً تو امت پر

عام فقر و فاقہ نہیں آئے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد عام فقر و فاقہ نہیں آیا، بلکہ کشادگی کا دور آتا چلا گیا، اور آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں پر فقر و فاقہ آبھی گیا تو اس فقر و فاقہ سے مجھے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ دنیاوی تکلیف ہو گی، لیکن اس سے گمراہی پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہو گا۔ البتہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اوپر دنیا اس طرح پھیلا دی جائے گی جس طرح پچھلی امتوں پر پھیلا دی گئی اور تمہارے چاروں طرف دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت کے انبار لگے ہوں گے اور اس وقت تم ایک دوسرے سے ریس کرو گے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو گے اور یہ سوچو گے کہ فلاں شخص کا جیسا بنگلہ ہے میرا بھی ویسا ہی ہو جائے، فلاں شخص کی جیسی کار ہے، میرے پاس بھی ویسی ہو جائے، فلاں شخص کے جیسے کپڑے ہیں میرے بھی ویسے ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی خواہش ہو گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دنیا تمہیں اس طرح ہلاک کر دے گی جس طرح پچھلی امتوں کو ہلاک کر دیا۔

جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے؟ صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ قالین تو بہت دور کی بات ہے ہمیں تو بیٹھنے کے لئے کھجور کے پتوں کی چٹائی بھی میسر نہیں ہے، ننگے فرش پر سونا پڑتا ہے، لہٰذا قالین کہاں، اور ہم کہاں؟ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ!

انا لنا الا نمار، قال انها ستکون

قالین ہمارے پاس کہاں سے آئیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ آج تو تمہارے پاس قالین نہیں ہیں۔ لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب تمہارے پاس قالین ہوں گے۔

(صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب دلائل النبوۃ، حدیث نمبر ۳۶۳۱)

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں ہے لیکن مجھے اس وقت کا ڈر ہے جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے اور دنیاوی ساز و سامان کی ریل پیل ہوگی اور تمہارے چاروں طرف دنیا پھیلی ہوئی ہوگی اس وقت تم کہیں اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کر دو، اور اس وقت تم پر کہیں دنیا غالب نہ آ جائے۔

جنت کے رومال اس سے بہتر ہیں

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شام سے ریشمی کپڑا آ گیا، ایسا کپڑا صحابہ کرام نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے صحابہ کرام اٹھ اٹھ کر ہاتھ لگا کر اس کو دیکھنے لگے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ صحابہ کرام اس کپڑے کو اس طرح دیکھ رہے ہیں تو آپ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ

"لمناديل سعد بن معاذ فى الجنة افضل من هذا"

(صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ، حدیث نمبر ۳۲۴۹)

"کیا اس کپڑے کو دیکھ کر تمہیں تعجب ہو رہا ہے اور کیا یہ کپڑا تمہیں بہت پسند آ رہا ہے؟ ارے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں جو رومال عطا فرمائے ہیں وہ اس کپڑے سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ گویا کہ آپ نے فوراً دنیا سے صحابہ کرام کی توجہ ہٹا کر آخرت کی طرف متوجہ فرمایا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت تمہیں دھوکے میں ڈال دے اور تم آخرت کی نعمتوں سے غافل ہو جاؤ، قدم قدم پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی گھٹی میں یہ بات ڈال دی کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے، یہ دنیا ناپائیدار ہے اس دنیا کی لذتیں، اس کی نعمتیں سب فانی ہیں اور یہ دنیا دل لگانے کی چیز نہیں۔

پوری دنیا مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"لوكانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة"

(ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ، حدیث نمبر ۲۳۲۱)

یعنی اگر اس دنیا کی حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو دنیا سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا کی دولت کافروں کو خوب مل رہی ہے اور وہ خوب مزے اڑا رہے ہیں باوجود یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں، مگر پھر بھی دنیا ان کو ملی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حقیقت ہے پوری دنیا کی حیثیت مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں ہے اگر اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافروں کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیا جاتا۔

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہے تھے، راستے میں آپ نے دیکھا کہ ایک بکری کا مرا ہوا کان کٹا بچہ پڑا ہوا ہے، اور اس کی بدبو پھیل رہی ہے۔ آپ نے بکری کے اس مردہ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص اس مردہ بچے کو ایک درہم میں خریدے گا؟ صحابہ کرام نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ بچہ اگر زندہ بھی ہوتا تب بھی کوئی شخص اس کو ایک درہم میں لینے کے لئے تیار نہ ہوتا، اس لئے کہ یہ عیب دار بچہ تھا۔ اور اب تو یہ مردہ ہے۔ اس لاش کو لے کر ہم کیا کرینگے؟ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ، یہ ساری دنیا اور اس کے مال و دولت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ بے حقیقت اور بے حیثیت ہے۔ جتنا بکری کا یہ مردہ بچہ تمہارے نزدیک بے حقیقت ہے۔

ساری دنیا ان کی غلام ہو گئی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صحابہ کرام کے دلوں میں بٹھا دی کہ دنیا سے دل مت لگاؤ، دنیا کی طرف رغبت کا اظہار مت کرو، ضرورت کے وقت دنیا کو استعمال ضرور کرو، لیکن محبت نہ کرو، یہی وجہ ہے کہ جب دنیا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دل سے نکل گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو ان کا غلام بنا دیا، کسریٰ ان کے قدموں میں آکر ڈھیر ہوا قیصر ان کی قدموں میں آکر ڈھیر ہوا، اور انہوں نے ان کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھی۔

شام کے گورنر حضرت عبیدہ بن جراح

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر بنا دیا گیا، اس لئے کہ شام کا اکثر علاقہ انہوں نے ہی فتح کیا تھا، اس وقت شام ایک بہت بڑا علاقہ تھا آج اس شام کے علاقے میں چار ممالک ہیں یعنی شام، اردن، فلسطین، لبنان اور اس وقت یہ چاروں مل کر اسلامی ریاست کا ایک صوبہ تھا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اس کے گورنر تھے اور شام کا صوبہ بڑا زرخیز تھا۔ مال و دولت کی ریل پیل تھی۔ اور روم کا پسندیدہ اور چہیتا علاقہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر سارے عالم اسلام کی کمان کر رہے تھے، چنانچہ وہ ایک مرتبہ معائنہ کے لئے شام کے دورہ پر تشریف لائے، شام کے دورہ کے دوران ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابو عبیدہ، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، جہاں تم رہتے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ تھا کہ ابو عبیدہ اتنے بڑے صوبے کے گورنر بن گئے ہیں اور یہاں مال و دولت کی ریل پیل ہے اس لئے ان کا گھر دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے کیا کچھ جمع کیا ہے۔

شام کے گورنر کی رہائش گاہ

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر المومنین! آپ میرے گھر کو دیکھ کر کیا کریں گے اس لئے کہ جب آپ میرے گھر کو دیکھیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ امیر المومنین کو لے کر چلے، شہر کے اندر سے گزر رہے تھے، جاتے جاتے جب شہر کی آبادی ختم ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کہاں لے جا رہے ہو؟ حضرت ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ بس اب تو قریب ہے۔ چنانچہ پورا دمشق شہر جو دنیا کے مال و اسباب سے جگ مگ کر رہا تھا، گزر گیا تو آخر میں لے جا کر کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ایک جھونپڑا دکھایا، اور فرمایا کہ امیر المومنین، میں اس میں رہتا

ہوں، جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا تو وہاں سوائے ایک مصلے کے کوئی چیز نظر نہیں آئی، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے ابو عبیدہ! تم اس میں رہتے ہو؟ یہاں تو کوئی ساز و سامان، کوئی برتن، کوئی کھانے پینے اور سونے کا انتظام کچھ بھی نہیں ہے، تم یہاں کیسے رہتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا کہ امیر المومنین الحمد للہ میری ضرورت کے سارے سامان میسر ہیں یہ مصلی ہے، اس پر نماز پڑھ لیتا ہوں، اور رات کو اس پر سو جاتا ہوں اور پھر اپنا ہاتھ اوپر چھپر کی طرف بڑھایا اور وہاں سے ایک پیالہ نکالا، جو نظر نہیں آرہا تھا، اور وہ پیالہ نکال کر دکھایا کہ امیر المومنین، برتن یہ ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اس برتن کو دیکھا تو اس میں پانی بھرا ہوا تھا اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے، اور پھر حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا کہ امیر المومنین، میں دن رات تو حکومت کے سرکاری کاموں میں مصروف رہتا ہوں، کھانے وغیرہ کے انتظام کرنے کی فرصت نہیں ہوتی ایک خاتون میرے لئے دو تین دن کی روٹی ایک وقت میں پکا دیتی ہے، میں اس روٹی کو رکھ لیتا ہوں اور جب وہ سوکھ جاتی ہے تو میں اس کو پانی میں ڈبو دیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت کھا لیتا ہوں۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۱ صفحہ ۷)

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا امیر المومنین، میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میرا مکان دیکھنے کے بعد آپ کو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابو عبیدہ! اس دنیا کی ریل پیل نے ہم سب کو بدل دیا، مگر خدا کی قسم تم ویسے ہی ہو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اس دنیا نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ حقیقت میں یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ ۔

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

ساری دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی دلکشیاں بھی سامنے ہیں اور اس کی رعنائیاں بھی سامنے ہیں اور دوسرے لوگ جو دنیا کی ریل پیل میں گھرے ہوئے ہیں وہ سب سامنے ہیں لیکن آنکھوں میں کوئی جچتا نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ جل جلالہ کی محبت اس طرح دل پر چھائی ہوئی ہے کہ ساری دنیا کے جگ مگ کرتے ہوئے مناظر دھوکہ نہیں دے سکتے، اللہ تعالیٰ کی محبت ہر وقت دل و دماغ پر مسلط اور طاری ہے، ہمارے حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ۔

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

(مجذوب)

یہ صحابہ کرام تھے جن کے قدموں میں دنیا ذلیل ہو کر آئی۔ لیکن دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی۔ حقیقت میں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت تھی۔ آپؐ نے بار بار صحابہ کرامؓ کو دنیا کی حقیقت کی طرف متوجہ کیا۔ اور بار بار دنیا کی بے ثباتی کی طرف اور آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتوں اور عذابوں کی طرف متوجہ کیا جس سے قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں۔

ایک دن مرنا ہے

انسان ذرا سوچے تو سہی تو یہ دنیا کس وقت تک کی ہے ایک دن کی، دو دن کی، تین دن کی، کسی کو پتہ ہے کہ کب تک اس دنیا میں رہوں گا؟ کیا اس کو یقین ہے کہ میں اگلے گھنٹے بلکہ اگلے لمحے زندہ رہوں گا؟ بڑے سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا فلسفی، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کتنی ہے؟ لیکن اس کے باوجود انسان دنیا کا ساز و سامان اکٹھا کرنے میں لگا ہوا ہے اور دن رات دنیا کی دوڑ دھوپ لگی ہے اور صبح سے شام تک اسی کا چکر چل رہا ہے اور جس دن بلاوا آئے گا سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے گا کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی۔

"دنیا" دھوکے کا سامان ہے

لہٰذا قرآن کریم کی یہ آیت:

"وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ"

(سورۃ حدید: ۲۰)

یہ بتا رہی ہے کہ دنیاوی زندگی دھوکے کا سودا ہے اس دھوکے کے سودے میں اس طرح نہ پڑ جانا کہ وہ تمہیں آخرت سے غافل کر دے اس دنیا سے ضرور گزرو مگر اس سے دھوکہ نہ کھاؤ اگر یہ بات دل میں اتر جائے تو پھر چاہے تمہاری کوٹھیاں کھڑی ہوں یا بنگلے ہوں یا مل ہوں۔ یا دنیا کا ساز سامان ہو یا مال و دولت ہو اور بنک بیلنس ہو لیکن ان کی محبت دل میں نہیں ہے تو پھر زاہد ہو الحمد للہ پھر تمہیں زھد کی نعمت حاصل ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ خسارے کا سودا اس شخص کا ہے جس نے دنیا میں کمایا تو کچھ بھی نہیں اور قلاش ہے مگر دل میں دنیا کی محبت بھری ہے تو اس شخص کو زھد حاصل نہیں ہے اس کو زاھد نہیں کہیں گے اس لئے کہ دنیا کی عشق و محبت میں مبتلا ہے اور ایسا شخص بڑے خسارے میں ہے۔

"زھد" کیسے حاصل ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قرآن و حدیث کے ان ارشادات پر غور کرے اور موت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا مراقبہ کرے اور آخرت کی نعمتوں کا، آخرت کے عذاب کا، دنیا کی بے ثباتی کا مراقبہ کرے اور اس کے لئے روزانہ پانچ دس منٹ کا وقت نکالے۔ اس سے رفتہ رفتہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

کیا مال و دولت کا نام دنیا ہے؟

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ ۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : جسٹس حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی
ضبط و ترتیب : محمد عبد اللہ میمن
تاریخ وقت : ۶ ستمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ، بعد نماز مغرب :

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا جب تک انسان کے ارد گرد ہے، اسکے چاروں طرف ہے، اور انسان اس سے اپنی ضروریات پوری کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے، پی رہا ہے، کما رہا ہے، اس وقت تک وہ اس کے لئے بہترین سرمایہ زندگی ہے. اور وہ خیر ہے اور فضل اللہ ہے، لیکن جس روز یہ دنیا ارد گرد سے ہٹ کر دل کی کشتی میں اس طرح داخل ہو گئی کہ ہر وقت اس کی محبت، اس کی فکر، اس کا خیال اس طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گیا کہ بس! اب اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے سوا کوئی خیال نہیں آتا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا تمہیں تباہ کر رہی ہے۔ پھر یہ دنیا "متاع الغرور" ہے پھر یہ دنیا فتنہ ہے، یہ دنیا مردار ہے اور اسکے طلب گار کتے ہیں۔

کیا مال و دولت کا نام دنیا ہے؟

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و اشھدان لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ و اشھدان سیدنا و سندنا وشفیعنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا۔

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وابتغ فی ما اتاک اللہ الدار الاخرۃ، ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض، ان اللہ لا یحب المفسدین۔

(سورۃ القصص: ۷۷)

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم۔ ونحن علیٰ ذالک من الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین۔

بزرگان محترم و برادران عزیز، ابھی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس کی تھوڑی سی تشریح اس مختصر وقت میں کرنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ صحیح طور پر اپنی رضائے کاملہ کے مطابق بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ایک غلط فہمی

اس آیت کا انتخاب میں نے اس لئے کیا کہ آج ایک بہت بڑی غلط فہمی اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے اور اس غلط فہمی کا مداوی اور اس کا ازالہ قرآن کریم کی اس آیت میں کیا گیا ہے، غلط فہمی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آج کی اس دنیا میں دین کے مطابق زندگی گزارنا چاہے، اور اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرنا چاہے تو اسے دنیا چھوڑنی ہوگی، دنیا کا عیش و آرام، دنیا کی آسائش چھوڑنی ہوگی اور دنیا کے مال واسباب کو ترک کئے بغیر اور اس سے قطع نظر کئے بغیر اس دنیا میں اسلام کے مطابق اور دین کے مطابق زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ اور اس غلط فہمی کا منشاء درحقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اسلام نے دنیا کے بارے میں کیا تصور پیش کیا ہے؟ یہ دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا کے مال واسباب اور اس کے عیش و آرام کی حقیقت کیا ہے؟ کس حد تک اسے اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اور کس حد تک اس سے اجتناب ضروری ہے؟ یہ بات ذہنوں میں پوری طرح واضح نہیں ہے۔

قرآن و حدیث میں دنیا کی مذمت

ذہنوں میں تھوڑی سی الجھن اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ یہ جملے کثرت سے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں دنیا کی مذمت کی گئی ہے، ایک روایت میں ہے کہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الدنیا جیفۃ وطالبوھا کلاب"

(کشف الخفاء للعجلونی، حدیث نمبر ۱۳۱۳)

کہ دنیا ایک مردار جانور کی طرح ہے، اور اس کے پیچھے لگنے والے کتوں کی طرح ہیں۔

اس حدیث کو اگرچہ بعض علماء نے لفظاً موضوع کہا ہے، لیکن ایک مقولے کے اعتبار سے اس کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ تو دنیا کو مردار قرار دیا گیا، اور اس کے طلب گار کو کتے قرار دیا گیا اسی طرح قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

(سورۃ آل عمران ۱۸۵)

یہ دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ فرمایا گیا:

"انما اموالکم و اولادکم فتنة"

(سورۃ التغابن: ۱۵)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک فتنہ ہے، ایک آزمائش ہے۔

ایک طرف تو قرآن و حدیث کے یہ ارشادات ہمارے سامنے آتے ہیں، جس میں دنیا کی برائی بیان کی گئی ہے اس یک طرفہ صورت حال کو دیکھ کر بعض اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان بننا ہے تو دنیا کو بالکل چھوڑنا ہوگا۔

دنیا کی فضیلت اور اچھائی

لیکن دوسری طرف آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مال کو بعض جگہ "فضل اللہ" قرار دیا، تجارت کے بارے میں فرمایا گیا کہ "ابتغوا من فضل اللہ" کہ تجارت کے ذریعے اللہ کے فضل کو تلاش کرنا ہے، چنانچہ سورۃ جمعہ میں جہاں جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، ہے اسی کے بعد آگے ارشاد فرمایا۔

"فاذا قضیت الصلاۃ فانتشروا فی الارض و ابتغوا من فضل اللہ"

(سورۃ الجمعۃ ۱۰)

کہ جب جمعہ کی نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔ تو

مال اور تجارت کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ اسی طرح بعض جگہ قرآن کریم نے مال کو "خیر" یعنی بھلائی قرار دیا، اور یہ دعا تو ہم اور آپ سب پڑھتے رہتے ہیں کہ:

"رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

(سورۃ البقرۃ ۲۰۱)

اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی عطا فرمائیے اور آخرت بھی بھی اچھائی عطا فرمائیے۔

تو بعض اوقات ذہن میں یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اتنی برائی کی جا رہی ہے کہ اس کو مردار کہا جا رہا ہے، اس کے طلب گاروں کو کتا کہا جا رہا ہے، اور دوسری طرف اس کو اللہ کا فضل قرار دیا جا رہا ہے، خیر کہا جا رہا ہے، اس کی اچھائی بیان کی جا رہی ہے تو ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

آخرت کے لئے دنیا چھوڑنے کی ضرورت نہیں

واقعہ یوں ہے کہ قرآن و حدیث کو صحیح طریقے سے پڑھنے کے بعد جو صورت حال واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے یہ نہیں چاہتے کہ ہم دنیا کو چھوڑ کر بیٹھ جائیں، عیسائی مذہب میں تو اس وقت تک اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک انسان بیوی بچوں اور گھر بار اور کاروبار کو چھوڑ کر نہ بیٹھ جائے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات ہمیں عطا فرمائیں، اس میں یہ کہیں نہیں کہا کہ تم دنیا کو چھوڑ دو، کمائی نہ کرو، تجارت نہ کرو، مال حاصل نہ کرو، مکان نہ بناؤ، بیوی بچوں کے ساتھ نہ سوبولو نہیں، کھانا نہ کھاؤ، اس قسم کا کوئی حکم شریعت محمدیہ میں موجود نہیں، ہاں! یہ ضرور کہا ہے کہ یہ دنیا تمہاری آخری منزل نہیں، یہ تمہاری زندگی کا آخری مقصد نہیں، یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہماری جو کچھ کاروائی ہے۔ وہ صرف اسی دنیا سے متعلق ہے، اس سے آگے ہمیں کچھ نہیں سوچنا ہے، اور نہ کچھ کرنا ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ دنیا درحقیقت اس لئے ہے کہ تاکہ تم اس میں رہ کر اپنی آنے والی ابدی زندگی یعنی آخرت کی زندگی کے لئے کچھ تیاری کر لو، اور آخرت کو فراموش کئے بغیر اس دنیا کو اس طرح استعمال کرو کہ اس میں تمہاری دنیاوی ضروریات بھی پوری ہوں، اور ساتھ ساتھ آخرت کی جو زندگی آنے والی ہے اس کی بھلائی بھی تمہارے

پیش نظر ہو۔

موت سے کسی کو انکار نہیں

یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بد سے بد تر کافر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے، موت آنی ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس میں آج تک کوئی شخص انکار نہیں کر سکا، یہاں تک کہ لوگوں نے خدا کا انکار کر دیا، لیکن موت کا منکر آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجھے موت نہیں آئے گی، میں ہمیشہ زندہ رہوں گا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو نہیں معلوم کہ کس کی موت کب آئے گی؟ بڑے سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا ڈاکٹر، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا فلسفی، وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ میری موت کب آئے گی؟

اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ آج تک کوئی سائنس فلسفہ کوئی ایسا علم ایجاد نہیں ہوا جو انسان کو براہ راست یہ بتا سکے کہ مرنے کے بعد کیا حالات پیش آتے ہیں، آج مغرب کی دنیا یہ تو تسلیم کر رہی ہے کہ کچھ ایسے اندازے معلوم ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اس نتیجے تک وہ پہنچ رہے ہیں، لیکن اس کے حالات کیا ہیں؟ اس میں انسان کا کیا حشر بنے گا؟ اس کی تفصیلات دنیا کی کوئی سائنس نہیں بتا سکی، جب یہ بات طے ہے کہ مرنا ہے، ہو سکتا ہے کہ کل ہی مر جائیں، اور یہ بھی طے ہے کہ مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے حالات کا براہ راست مجھے علم نہیں، ہاں! ایک کلمہ "لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان لایا ہوں اور "محمد رسول اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے جو بھی خبر لے کر آئے ہیں، وہ سچی بات ہے اس میں جھوٹ کا کوئی امکان نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ اور یہ موجودہ زندگی ایک حد پر جا کر ختم ہو جائے گی اور وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، بلکہ ابدی ہے، لامتناہی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

اسلام کا پیغام

تواسلام کا پیغام یہ ہے کہ دنیا میں ضرور رہو، اور دنیا کی چیزوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤ، دنیا سے لطف اندوز بھی ہو، لیکن ساتھ ساتھ اس دنیا کو آخری مشن اور آخری منزل نہ سمجھو۔

دنیا کی خوب صورت مثال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے دنیا کے بارے میں ایک خوب صورت مثال دی ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ اگر یہ بات ذہن میں ہو تو دنیا کے بارے میں کبھی غلط فہمی پیدا نہ ہو وہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال پانی جیسی ہے، اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، اگر ایک کشتی آپ پانی کے بغیر چلانا چاہیں تو وہ کشتی نہیں چل سکتی، کوئی کشتی ایسی نہیں ہے جو پانی کے بغیر چل سکتی ہو، پانی کشتی کے لئے ناگزیر ہے، اسی طرح انسان دنیا کے مال و اسباب کے بغیر اور کھائے کمائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن آگے فرماتے ہیں کہ یہ پانی اس وقت تک کشتی کے لئے فائدہ مند ہے جب تک کہ وہ کشتی کے ارد گرد اور نیچے ہو، اگر یہ پانی کشتی کے اندر گھس آئے تو وہ کشتی کے لئے فائدہ مند ہونے کے بجائے کشتی کو ڈبو دے گا، تو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا جب تک انسان کے ارد گرد اور اسکے چاروں طرف ہے، اور انسان اس سے اپنی ضروریات پوری کر رہا ہے، کھا رہا ہے، پی رہا ہے، کما رہا ہے، اس وقت تک وہ اس کے لئے بہترین سرمایہ زندگی ہے، اور وہ خیر ہے اور "فضل اللہ" ہے، لیکن جس روز یہ دنیا ارد گرد سے ہٹ کر دل کی کشتی میں اس طرح داخل ہو گئی کہ ہر وقت اس کی محبت، اس کی فکر، اس کا خیال اس طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گیا کہ بس اب اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، اس کے سوا کوئی خیال نہیں آتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا تمہیں تباہ کر رہی ہے، پھر یہ دنیا "متاع الغرور" ہے، پھر یہ دنیا "فتنۃ" ہے، یہ دنیا مردار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں، جو اس دنیا کو اپنے ارد گرد سے ہٹا کر اپنے دل کی کشتی میں سوار کر رہے ہیں۔

(مفتاح العلوم۔ مثنوی مولانا روم ج ۲ ص ۳۷ دفتر اول۔ حصہ دوم)

دنیا آخرت کے لئے ایک سیڑھی ہے

درحقیقت ایک مسلمان کے لئے یہ پیغام ہے کہ دنیا میں رہو، دنیا کو برتو، دنیا کو استعمال کرو، لیکن فرق صرف زاویہ نگاہ کا ہے، اگر تم دنیا کو اس لئے استعمال کر رہے ہو کہ یہ آخرت کی منزل کے لئے ایک سیڑھی ہے، تو یہ دنیا تمہارے لئے خیر ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور اگر دنیا کو اس نیت سے استعمال کر رہے ہو کہ یہ تمہاری آخری منزل ہے، اور بس اس کی بھلائی بھلائی ہے، اور اس کی اچھائی اچھائی ہے، اور اس سے آگے کوئی چیز نہیں، تو پھر یہ دنیا تمہارے لئے ہلاکت کا سامان ہے۔

دنیا دین بن جاتی ہے

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں کہ یہ دنیا مردار ہے جب کہ اس کی محبت اور اس کا خیال دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ صبح سے لے کر شام تک دنیا کے سوا کوئی خیال نہ آئے، لیکن اگر اس دنیا کو اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کر رہے ہو تو پھر یہ دنیا بھی انسان کے لئے دنیا نہیں رہتی، بلکہ دین بن جاتی ہے، اور اجر و ثواب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

قارون کو نصیحت

اور دنیا کو کیسے دین بنایا جاتا ہے؟ اس کا طریقہ قرآن کریم نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے جو میں نے آپ کے سامنے ابھی تلاوت کی، یہ سورۃ قصص کی آیت ہے، اور اس میں قارون کا ذکر ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بہت بڑا سرمایہ دار تھا، اور قرآن کریم نے فرمایا کہ اس کے اتنے خزانے تھے کہ (اس زمانے میں دولت خزانوں میں رکھی جاتی تھی، اور بڑے موٹے بھاری قسم کے تالے ہوا کرتے تھے، اور چابیاں بھی بہت لمبی چوڑی ہوتی تھیں) اس کے خزانوں کی چابیاں اٹھانے کے لئے پوری جماعت درکار ہوتی تھی، ایک آدمی اس کے خزانوں کی چابیاں نہیں اٹھا سکتا تھا، اتنا بڑا سرمایہ دار تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جو نصیحت اور پیغام دیا گیا تھا وہ اس آیت میں

بیان کیا گیا ہے، اس نصیحت میں قارون سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اپنے اس سارے خزانوں سے دست بردار ہو جاؤ، یا اپنا مال و دولت آگ میں پھینک دو، بلکہ اس کو یہ نصیحت کی گئی کہ

"وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ"

کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ مال و دولت روپیہ پیسہ، عزت شہرت، مکان، سواریاں، نوکر چاکر جو کچھ بھی دیا ہے اس سے اپنے آخرت کے گھر کی بھلائی طلب کرو، اس سے اپنی آخرت بناؤ، یہ جو فرمایا کہ "جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے" اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ایک انسان خواہ کتنا ماہر ہو، کتنا ذہین ہو، کتنا تجربہ کار ہو، لیکن جو کچھ وہ کماتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ قارون کہتا تھا کہ۔

"انما اوتیتہ علیٰ علم عندی"

(سورۃ القصص: ۷۸)

میرے پاس جو علم، جو ذہانت اور تجربہ ہے اس کی بدولت مجھے یہ ساری دولت حاصل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ تمہیں دیا گیا وہ اللہ کی عطا ہے اس دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو بڑے ذہین ہیں، مگر بازار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ایک تو اس بات کا استحضار کرو کہ جو کچھ مال ہے، خواہ وہ روپیہ پیسہ کی شکل میں ہو، سامان تجارت کی شکل میں ہو، مکان کی شکل میں ہو، یہ سب اللہ کی عطا ہے۔

کیا سارا مال صدقہ کر دیا جائے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جو کچھ ہمارے پاس مال ہے وہ سارا کا سارا صدقہ کر دیں؟ اس لئے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مال کو آخرت کے لئے استعمال کرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ جو کچھ بھی مال ہے وہ صدقہ کر دیا جائے، لیکن قرآن کریم نے اگلے جملے میں اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا"

دنیا میں جتنا حصہ تمہیں ملنا ہے، اور جو تمہارا حق ہے، اس کو مت بھولو، اور اس سے دست بردار مت ہوجاؤ، بلکہ اس کو اپنے پاس رکھو، لیکن اس مال کے ساتھ یہ معاملہ کرو کہ:

"وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ"

جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا کہ تم کو یہ مال عطا فرمایا، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور آگے فرمایا کہ:

"ولا تبغ الفساد فی الارض"

اور اس مال کو زمین میں فساد اور بگاڑ پھیلانے کے لئے استعمال مت کرو۔

زمین میں فساد کا سبب

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جن کاموں کو حرام اور ناجائز قرار دے دیا، اس کو انجام دینے سے قرآن کریم کی اصطلاح کے مطابق زمین میں فساد پھیلتا ہے، مال حاصل کرنے کے جس طریقے کو اللہ تعالیٰ نے ناجائز بتادیا، اگر وہ طریقہ استعمال کروگے تو زمین میں فساد پھیلے گا، مثلاً چوری کرکے مال حاصل کرنا، ڈاکہ ڈال کر مال حاصل کرنا حرام ہے، کوئی شخص اگر یہ طریقہ اختیار کرے گا تو زمین میں فساد پھیلے گا، کوئی شخص دوسرے کا حق مار کر اور دوسرے کو دھوکہ دے کر فریب دے کر مال حاصل کرے گا تو اس سے زمین میں فساد پھیلے گا، اور سود کے ذریعہ اور قمار کے ذریعہ یا اور دوسرے حرام طریقوں سے مال حاصل کرے گا تو وہ سب فساد فی الارض میں داخل ہوگا، ہم سب سے قرآن کریم کا مطالبہ یہ ہے کہ مال ضرور حاصل کریں اور مال کو حاصل کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ مال حاصل کرنے کا یہ طریقہ حلال ہے یا حرام، اگر وہ حرام ہے تو پھر چاہے وہ کتنی ہی بڑی دولت کیوں نہ ہو، اس کو ٹھکرا دو، اور اگر حلال ہے تو اس کو اختیار کرو۔

دولت سے راحت نہیں خریدی جا سکتی۔

یاد رکھئے مال اپنی ذات میں کوئی نفع دینے والی چیز نہیں، بھوک کے وقت ان پیسوں کو کوئی نہیں کھاتا، پیاس لگے تو اس کے ذریعے پیاس نہیں بجھا سکتے، لیکن انسان کو راحت پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے، اور راحت اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے، حرام طریقوں سے مال حاصل کر کے اگر تم نے بہت بینک بیلنس بڑھا لیا، اور بہت خزانے بھر لئے، لیکن اس کے ذریعہ راحت حاصل ہونا کوئی ضروری نہیں، بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ حرام دولت کے انبار جمع ہو گئے، لیکن راحت حاصل نہ ہو سکی، رات کو اس وقت تک نیند نہیں آتی جب تک نیند کی گولیاں نہ کھائے، مال و دولت، مل فیکٹری، سامان تجارت، نوکر چاکر سب کچھ ہے، لیکن جب کھانے کے لئے دستر خوان پر بیٹھا تو بھوک نہیں لگتی، اور بستر پر سونے کے لئے لیٹا، مگر نیند نہیں آتی، دوسری طرف ایک مزدور ہے، جو آٹھ گھنٹے محنت مزدوری کرنے کے بعد ڈٹ کر کھانا کھاتا ہے اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر سوتا ہے، تو اب بتائیے اس مزدور کو راحت ملی یا اس صاحب بہادر کو جو بہت عالیشان بستر پر ساری رات کروٹیں بدلتا رہا؟ حقیقت میں راحت اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ کا مسلمان کے ساتھ یہ اصول ہے کہ اگر وہ حلال طریقے سے دولت حاصل کرے گا تو وہ اس کو راحت اور سکون عطا کریں گے، اگر وہ حرام طریقے سے حاصل کرے گا تو وہ شاید دولت کے انبارے تو جمع کر لے، لیکن جس چیز کا نام سکون ہے، جس کا نام راحت ہے، اس کو وہ دنیا کے انبار میں بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔

دنیا کو دین بنانے کا طریقہ

تو پیغام صرف اتنا ہے کہ مال کمانے میں حرام طریقوں سے بچو، اور تمہاری حاصل شدہ دولت پر جو فرائض عائد کئے گئے ہیں، خواہ وہ زکوٰۃ کی شکل میں ہو، یا خیرات و صدقات کی شکل میں ہو، ان کو بجالاؤ، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے تم دوسروں کے ساتھ احسان کرو، اگر انسان یہ اختیار کر لے، اور جو نعمت انسان کو ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، تو دنیا کی ساری نعمتیں اور دولتیں دین بن جائیں

گی. اور وہ سب اجر بن جائیں گی، پھر کھانا کھائے گا تو بھی اجر ملے گا اور پانی پیئے گا تو بھی اجر ملے گا، تجارت کرے گا تو بھی اجر ملے گا، اور دنیا کی اور راحتیں اختیار کرے گا تو اس پر بھی اجر ملے گا، کیونکہ اس نے اس دنیا کو اپنا مقصد نہیں بنایا؛ بلکہ مقصد کیلئے ایک راستہ اور ایک ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنی آخرت تلاش کر رہا ہے، حرام کاموں سے بچتا ہے، اور اپنے واجبات کو ادا کرتا ہے تو ساری دنیا دین بن جاتی ہے، اور وہ دنیا اللہ تعالیٰ کا "فضل" بن جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہم س کو اس بات کی صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

جھوٹ

اور

اس کی مروجہ صورتیں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت : ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء۔ بروز جمعہ بعد نماز عصر
مقام : جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی

عرض ناشر

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں منافق کی تین علامتیں بیان فرمائیں ہیں ایک جھوٹ بولنا، دوسرے وعدہ خلافی کرنا، تیسرے امانت میں خیانت کرنا، چونکہ ان تینوں علامتوں پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے علیحدہ علیحدہ تین جمعوں میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تھا، اس لئے ان تینوں خطبات کو علیحدہ علیحدہ شائع کیا جارہا ہے۔

ولی اللہ میمن
میمن اسلامک پبلشرز

آج "جھوٹ" ہماری زندگی میں اس طرح سرایت کر گیا ہے، جسے رگوں میں خون سرایت کر رہا ہے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے زبان سے جھوٹ نکل جاتا ہے، بعض اوقات ہم مذاق کی خاطر، بعض اوقات فائدہ حاصل کرنے کی خاطر، بعض اوقات اپنے کو بڑا ظاہر کرنے کی خاطر زبان سے جھوٹ بات نکال دیتے ہیں، اس کا عام رواج ہو گیا ہے، اور یہ رواج اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ لوگ اس کو ناجائز اور گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اور بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہماری نیکی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جھوٹ

اور

اس کی مروجہ صورتیں

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، واشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیمًا کثیرًا۔

امابعد!

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان۔ فی روایۃ وان صام وصلی وزعم انہ مسلم

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق حدیث نمبر ۳۳)

منافق کی تین علامتیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں، جو منافق ہونے کی نشانی ہیں۔ یعنی کسی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے، اگر کسی انسان میں یہ باتیں پائی جائیں تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو وہ خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ چاہے وہ نماز بھی پڑھتا ہو، اور روزے بھی رکھتا ہو اور چاہے وہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، اس لئے کہ مسلمان ہونے کی جو بنیادی صفات ہیں، وہ ان کو چھوڑے ہوئے ہے۔

اسلام ایک وسیع مذہب ہے

خدا جانے یہ بات ہمارے ذہنوں میں کہاں سے بیٹھ گئی ہے، اور ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دین بس! نماز روزے کا نام ہے، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اور نماز روزے کا اہتمام کر لیا، بس مسلمان ہو گئے، اب مزید ہم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں ہے، چنانچہ جب بازار گئے تو اب وہاں جھوٹ فریب اور دھوکے سے مال حاصل ہو رہا ہے، حرام اور حلال ایک ہو رہے ہیں اس کی کوئی فکر نہیں، زبان کا بھروسہ نہیں، امانت میں خیانت ہے۔ وعدہ کا پاس نہیں۔ لہٰذا اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ بس نماز روزہ کا نام ہے۔ یہ بڑا خطرناک اور غلط تصور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ ایسا شخص چاہے نماز بھی پڑھ رہا ہو، اور روزے بھی رکھ رہا ہو، لیکن وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، چاہے اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ، اس لئے کہ کفر کا فتویٰ لگانا بڑی سنگین چیز ہے، اور فتویٰ کے اعتبار سے اس کو کافر نہ قرار دو، دائرہ اسلام سے اس کو خارج نہ کرو لیکن ایسا شخص سارے کام کافروں جیسے اور منافق جیسے کر رہا ہے۔

فرمایا کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں، نمبر ایک جھوٹ بولنا دوسرے وعدہ

خلافی کرنا، تیسرے امانت میں خیانت کرنا، ان تینوں کی تھوڑی سی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں کا تصور بہت محدود ہے، حالانکہ ان تینوں کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے۔ اس لئے ان کی تھوڑی سی تفصیل کرنے کی ضرورت ہے۔

زمانہ جاہلیت اور جھوٹ

چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جھوٹ بولنا۔ یہ جھوٹ بولنا حرام ہے ایسا حرام ہے کہ کوئی ملت، کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں جھوٹ بولنا حرام نہ ہو، یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے، واقعہ یاد آیا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے بادشاہ کی طرف اسلام کی دعوت کے لئے خط بھیجا تو خط پڑھنے کے بعد اس نے اپنی درباریوں سے کہا کہ ہمارے ملک میں اگر ایسے لوگ موجود ہوں، جو ان (حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم) سے واقف ہوں تو ان کو میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں ان سے حالات معلومات کروں کہ وہ کیسے ہیں، اتفاق سے اسی وقت حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے، چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لے آئے، یہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو بادشاہ نے ان سے سوالات کرنا شروع کئے پہلا سوال یہ کیا کہ یہ بتاؤ کہ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ کیسا خاندان ہے؟ اس کی شہرت کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خاندان تو بڑے اعلیٰ درجے کا ہے، اعلیٰ درجے کے خاندان میں وہ پیدا ہوئے۔ اور سارا عرب اس خاندان کی شرافت کا قائل ہے۔ اس بادشاہ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا بالکل ٹھیک ہے، جو اللہ کے نبی ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ خاندان سے ہوتے ہیں پھر دوسرا سوال بادشاہ نے یہ کیا کہ ان کی پیروی کرنے والے معمولی درجے کے لوگ ہیں، یا بڑے بڑے رؤساء ہیں۔ انہوں نے جواب کہ ان کے متبعین کی اکثریت کم درجے کے معمولی قسم کے لوگ ہیں، بادشاہ نے تصدیق کی نبی کے متبعین ابتداء ضعیف اور کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر سوال کیا کہ تمہاری ان کے ساتھ جب جنگ ہوتی ہے تو تم جیت جاتے ہو یا وہ جیت جاتے ہیں؟ اس وقت تک

چونکہ صرف دو جنگیں ہوئی تھیں۔ ایک جنگ بدر، اور ایک احد، اور غزوہ احد میں چونکہ مسلمانوں کو تھوڑی سی شکست ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس موقع پر جواب دیا کہ کبھی ہم غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں۔

جھوٹ نہیں بول سکتا تھا

حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کے بعد فرماتے تھے کہ اس وقت تو میں کافر تھا۔ اس لئے اس فکر میں تھا کہ میں کوئی ایسا جملہ کہہ دوں جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تاثر قائم ہو، لیکن اس بادشاہ نے جتنے سوالات کئے، ان کے جواب میں اس قسم کی کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملا، اس لئے کہ جو سوال وہ کر رہا تھا۔ اس کا جواب تو مجھے دینا تھا۔ اور جھوٹ بول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں جتنے جوابات دے رہا تھا۔ وہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جا رہے تھے۔ بہرحال! جاہلیت کے لوگ جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے وہ بھی جھوٹ بولنے کو گوارہ نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ مسلمان اسلام لانے کے بعد جھوٹ بولے؟

(صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی حدیث نمبر ۷)

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلاء ہے یہاں تک کہ جو لوگ حرام و حلال اور جائز ناجائز کا اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کر رہے ہیں۔ غلط بیانی کر رہے ہیں، اور اس میں دوہرا جرم ہے۔ ایک جھوٹ بولنے کا جرم، اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم، چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز روزے کے پابند، اذکار واشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا۔ ایک مرتبہ جب پاکستان آئے تو میرے پاس بھی ملاقات کے لئے آگئے، میں نے ان سے پوچھا کہ

آپ واپس کب تشریف لے جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہروں گا، میری چھٹیاں تو ختم ہو گئیں۔ البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لئے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوا دیا ہے۔

کیا دین نماز روزے کا نام ہے؟

انہوں نے میڈیل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمول کی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لئے بھیج دیا ہے، ویسے اگر چھٹی لیتا تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائیں گی، میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں، میں نے کہا کہ کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟ ذکر شغل کا نام ہے؟ آپ کا بزرگوں سے تعلق ہے، پھر یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا جا رہا ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے، میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے، اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینی ضروری ہو تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے، اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا۔ باقی زندگی کے میدان میں جاکر جھوٹ بول رہا ہو تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

جھوٹی سفارش

ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے نیک اور سمجھدار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں یہ لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس

آرہے ہیں یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کے لئے سفارش کر دیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کر دیا جائے اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں، اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہو گیا ہے، اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آپ ان کی سفارش کر دیں۔

اب آپ بتایئے! وہاں عمرے ہو رہے ہیں، حج بھی ہو رہا ہے، طواف اور سعی بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ میں یہ جھوٹ اور فریب بھی ہو رہا ہے، گویا کہ یہ دین کا حصہ ہی نہیں ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کر کے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینا، جھوٹی سفارش لکھوالینا۔ یا جھوٹے مقدمات دائر کر دینا، یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید

(سورۃ ق: ۱۸)

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے۔ وہ تمہارے نامہ اعمال میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔

بچوں کے ساتھ جھوٹ نہ بولو

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک خاتون ایک بچے کو بلا کر گود میں لینا چاہتی تھی، لیکن وہ بچہ قریب نہیں آرہا تھا، ان خاتون نے بچے کو بہلانے کے لئے کہا کہ بیٹا یہاں آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات وہ سن لی، اور آپ نے خاتون سے پوچھا کہ تمہارا کوئی چیز دینے کا ارادہ ہے یا ویسے ہی اس کو بلانے اور بہلانے کے لئے کہہ رہی ہو؟ اس خاتون نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا کھجور دینے کا ارادہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اس کو کھجور دوں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہارا کھجور دینے کا ارادہ نہ ہوتا، بلکہ محض بہلانے کے لئے کہتی کہ میں تمہیں کھجور دوں گی، تو تمہارے نامہ اعمال

میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔

(ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی التشدید فی الکذب حدیث نمبر ۴۹۹۱)

اس حدیث سے یہ سبق دے دیا کہ بچے کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولو، اور اس کے ساتھ بھی وعدہ خلافی نہ کرو، ورنہ شروع ہی سے جھوٹ کی برائی اس کے دل سے نکل جائے گی۔

مذاق میں جھوٹ نہ بولو

ہم لوگ محض مذاق اور تفریح کے لئے زبان سے جھوٹی باتیں نکال دیتے ہیں، حلانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذاق میں بھی جھوٹی باتیں زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ کہ افسوس ہے اس شخص پر یا سخت الفاظ میں اس کا صحیح ترجمہ یہ کر سکتے ہیں کہ: اس شخص کے لئے کہ دردناک عذاب ہے، جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے

(ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی التشدید فی الکذب، حدیث نمبر ۴۹۹۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق

خوش طبعی کی باتیں اور مذاق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا، لیکن کبھی کوئی ایسا مذاق نہیں کیا جس میں بات غلط ہو، یا واقعہ کے خلاف ہو، آپ نے کیسا مذاق کیا حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بڑھیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے لئے دعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، اور وہ بڑھیا رونے لگی کہ یہ تو بڑی خطرناک بات ہو گئی کہ بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی پھر آپ نے وضاحت کر کے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت اس حالت میں جنت میں نہیں جائے گی کہ وہ بوڑھی ہو، بلکہ وہ جوان ہو کر جائے گی، تو آپ نے ایسا لطیف مذاق فرمایا کہ اس میں کوئی بات نفس الامر کے خلاف اور جھوٹی نہیں تھی۔

(الشمائل للترمذی، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

مذاق کا ایک انوکھا انداز

ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایک اونٹنی دے دیجئے، آپ نے فرمایا کہ ہم تم کو ایک اونٹنی کا بچہ دیں گے، اس نے کہا! یا رسول اللہ! میں بچے کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو سواری کے لئے ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں جو بھی اونٹ دیا جائے گا وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہو گا، یہ آپ نے اس سے مذاق فرمایا، اور ایسا مذاق جس میں خلاف حقیقت اور غلط بات نہیں کہی۔ تو مذاق کے اندر بھی اس بات کا لحاظ ہے کہ زبان کو سنبھال کر استعمال کریں، اور زبان سے کوئی لفظ غلط نہ نکل جائے، اور آج کل ہمارے اندر سچے جھوٹے قصے پھیل گئے ہیں، اور خوش گپیوں کے اندر ہم ان کو بطور مذاق بیان کر دیتے ہیں۔ یہ سب جھوٹ کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

(الشمائل للترمذی، باب ماجاء فی مزاح النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل اس کا عام رواج ہو گیا ہے، اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، یا دوسروں کیلئے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آگئی، اب وہ کسی کے پاس گیا، اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا، اور جاری کرنے والے نے اس کے اندر یہ لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق و کردار بہت اچھا ہے، کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم یہ ناجائز کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں، اس لئے کہ یہ ضرورت مند تھا۔ ہم نے اس کی ضرورت پوری کر دی۔ اس کا کام کر دیا، یہ تو باعث ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے لئے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کر رہا ہوں۔ اور

کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جو آپ کو نہیں جانتا۔ یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا، اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

کیریکٹر معلوم کرنے کے دو طریقے

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص نے کسی تیسرے شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص بڑے اچھے اخلاق اور کردار کا آدمی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ پیش آیا؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، لین دین کا معاملہ تو کبھی پیش نہیں آیا، پھر آپ نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا؟ اس نے کہا نہیں، میں نے کبھی اس کے ساتھ سفر تو نہیں کیا، آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے کیسا آدمی ہے، اس لئے کہ اخلاق و کردار کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انسان اس کے ساتھ لین دین کرے، اور اس میں وہ کھرا ثابت ہو، تب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کردار اچھا ہے، اور اس کے اخلاق معلوم کرنے کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے۔ اس لئے کہ سفر کے اندر انسان اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے، اس کے اخلاق، اس کا کردار، اس کے حالات، اس کے جذبات، اس کے خیالات، یہ ساری چیزیں سفر میں ظاہر ہو جاتی ہیں، لہٰذا اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا ہوتا، یا اس کے ساتھ سفر کیا ہوتا، تب تو بیشک یہ کہنا درست ہوتا کہ وہ اچھا آدمی ہے، لیکن جب تم نے اس کے ساتھ نہ تو معاملہ کیا، نہ اس کے ساتھ سفر کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جانتے نہیں ہو، اور جب تم جانتے نہیں تو پھر خاموش رہو، نہ برا کہو، اور نہ اچھا کہو، اور اگر کوئی شخص اس کے بارے پوچھے تو تم اس حد تک بتا دو، جتنا تمہیں معلوم ہے، مثلاً یہ کہہ دو کہ بھائی! مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے تو میں نے دیکھا ہے، باقی آگے کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

سرٹیفکیٹ ایک گواہی ہے

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

الا من شهد بالحق وهم يعلمون

(سورۃ الزخرف. ٨٦)

یاد رکھئے: یہ سرٹیفکیٹ اور یہ تصدیق نامہ شرعاً ایک گواہی ہے، اور جو شخص اس سرٹیفکیٹ پر دستخط کر رہا ہے، وہ حقیقت میں گواہی دے رہا ہے اور اس آیت کی رو سے گواہی دینا اس وقت جائز ہے جب آدمی کو اس بات کا علم ہو، اور یقین سے جانتا ہو کہ یہ واقع میں ایسا ہے، تب انسان گواہی دے سکتا ہے، اس کے بغیر انسان گواہی نہیں دے سکتا۔ آجکل ہوتا یہ ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن آپ نے کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، تو یہ جھوٹی گواہی کا گناہ ہوا، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا،

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، صحابہ کرم سے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرانا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دھرایا۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان، باب بیان الکبائر حدیث نمبر ۱۴۳)

اب آپ اس سے اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دھرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ.

"فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور"

(سورۃ الحج: ۳۰)

یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو، اور جھوٹی بات سے بچو اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا گناہ گار ہو گا

جھوٹی گواہی دینا جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، مثلاً ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ، اس لئے کہ جب آپ نے غلط سرٹیفکیٹ جاری کر کے جھوٹی گواہی دی۔ اور وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جب دوسرے شخص کے پاس پہنچا تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ آدمی بڑا اچھا ہے، اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرے گا، اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی یا آپ نے عدالت میں جھوٹی گواہی دی۔ اور اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ ہو گیا، تو اس فیصلے کے نتیجے میں جو کچھ کسی کا نقصان ہوا۔ وہ سب آپ کی گردن پر ہو گا۔ اس لئے یہ جھوٹی گواہی کا گناہ معمولی گناہ نہیں ہے، بڑا سخت گناہ ہے۔

عدالت میں جھوٹ

آج کل تو جھوٹ کا ایسا بازار گرم ہوا کہ کوئی شخص دوسری جگہ جھوٹ بولے یا نہ بولے، لیکن عدالت میں ضرور جھوٹ بولے گا بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا کہ:

"میاں! سچی سچی بات کہہ دو کوئی عدالت میں تھوڑی کھڑے ہو"

مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی جگہ تو عدالت ہے۔ وہاں پر جاکر جھوٹ بولنا، یہاں آپس میں جب بات چیت ہو رہی ہے تو سچی سچی بات بتا دو، حالانکہ عدالت میں جاکر جھوٹی گواہی دینے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے برابر قرار دیا ہے، اور یہ

کئی گناہوں کا مجموعہ ہے۔

مدرسہ کی تصدیق گواہی ہے

لہٰذا جتنے سرٹیفکیٹ معلومات کے بغیر جاری کئے جارہے ہیں، اور جاری کرنے والا یہ جانتے ہوئے جاری کر رہا ہے کہ میں یہ غلط سرٹیفکیٹ جاری کر رہا ہوں، مثلاً کسی کے بیمار ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ یا کسی کے پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ دے دیا، یہ سب جھوٹی گواہی کے اندر داخل ہیں۔

میرے پاس بہت سے لوگ مدرسوں کی تصدیق کرانے کے لئے آتے ہیں، جس میں اس بات کی تصدیق کرنی ہوتی ہے کہ یہ مدرسہ قائم ہے، اس میں اتنی تعلیم ہوتی ہے۔ اور اس تصدیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو جائے کہ واقعتہً یہ مدرسہ قائم ہے۔ اور امداد کا مستحق ہے، اور لب ان مدرسوں کی تصدیق لکھنے کو دل بھی چاہتا ہے، لیکن میں نے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی شخص مدرسہ کی تصدیق لکھوانے کے لئے آتا تھا تو آپ یہ عذر فرماتے ہوئے کہتے کہ بھائی! یہ ایک گواہی ہے، اور جب تک مجھے مدرسہ کے حالات کا علم نہ ہو، اس وقت تک میں یہ تصدیق نامہ جاری نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی البتہ اگر کسی مدرسے کے بارے میں علم ہوتا تو جتنا علم ہوتا اتنا لکھ دیتے۔

کتاب کی تقریظ لکھنا گواہی ہے

بہت سے لوگ کتابوں پر تقریظ لکھوانے آجاتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب لکھی ہے، آپ اس پر تقریظ لکھ دیجئے کہ یہ اچھی کتاب ہے، اور صحیح کتاب ہے۔ حالانکہ جب تک انسان اس کتاب کو پورا نہ پڑھے، اس کا پورا مطالعہ نہ کرے، اس وقت تک یہ کیسے گواہی دے دے کہ یہ کتاب صحیح ہے، یا غلط ہے۔ بہت سے لوگ اس خیال سے تقریظ لکھ دیتے ہیں کہ اس تقریظ سے اس کا فائدہ اور بھلا ہو جائے گا، حالانکہ تقریظ لکھنا ایک گواہی ہے، اور اس گواہی میں غلط بیانی کو لوگوں نے غلط بیانی سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو ایک ذرا سا کام لے کر ان کے پاس گئے تھے، اگر ذرا

سا قلم ہلا دیتے۔ اور ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا، یہ تو بڑے بد اخلاق آدمی ہیں، کہ کسی کو سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں کرتے، بھائی، بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک لفظ کے بارے میں سوال ہوگا، جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، جو لفظ قلم سے لکھا جا رہا ہے، سب اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ فلاں لفظ تم نے جو زبان سے نکالا تھا۔ وہ کس بنیاد پر نکالا تھا، جان بوجھ کر بولا تھا، یا بھول کر بولا تھا۔

جھوٹ سے بچئے

بھائی! ہمارے معاشرے میں جو جھوٹ کی وبا پھیل گئی ہے، اس میں اچھے خاصے دیندار، پڑھے لکھے، نمازی، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، وظائف اور تسبیح پڑھنے والے بھی مبتلا ہیں، وہ بھی اس کو ناجائز اور برا نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا تو یہ کوئی گناہ ہوگا، حالانکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ "اذا حدث کذب" اس میں یہ سب باتیں بھی داخل ہیں، اور یہ سب دین کا حصہ ہیں۔ اور ان کو دین سے خارج سمجھنا بد ترین گمراہی ہے، اس لئے ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

جھوٹ کی اجازت کے مواقع

البتہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن وہ مواقع ایسے ہیں کہ جہاں انسان اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے، اور جان بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو، یا کوئی ناقابل برداشت ظلم اور تکلیف کا اندیشہ ہو، کہ اگر وہ جھوٹ نہیں بولے گا تو وہ ایسے ظلم کا شکار ہو جائے گا جو قابل برداشت نہیں ہے، اس صورت میں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ البتہ اس میں بھی حکم یہ ہے کہ پہلے اس بات کی کوشش کرو کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے، بلکہ کوئی ایسا گول مول لفظ بول دو، جس سے وقتی مصیبت ٹل

جائے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں "تعریض اور توریہ" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ بول دیا جائے، جس کے ظاہری طور پر کچھ اور معنی سمجھ میں آرہے ہیں، اور حقیقت میں دل کے اندر آپ نے کچھ اور مراد لیا ہے، ایسا گول مول لفظ بول دو تاکہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا جھوٹ سے اجتناب

ہجرت کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرمارہے تھے۔ تو اس وقت مکہ والوں نے آپ کو پکڑنے کے لئے چاروں طرف اپنے ہرکارے دوڑا رکھے تھے۔ اور یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام کے طور پر دیئے جائیں گے، اب اس وقت سارے مکہ کے لوگ آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے، راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جاننے والا ایک شخص مل گیا، وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا۔ مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتا تھا، اس شخص نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں تک آپ کے بارے میں اطلاع پہنچ جائے۔ اب اگر اس شخص کے جواب میں صحیح بات بتاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان خطرہ ہے، اور اگر نہیں بتاتے تو جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اب ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ:

هذا الرجل يهديني السبيل

یہ میرے رہنما ہیں، جو مجھے راستہ دکھاتے ہیں، اب آپ نے ایسا لفظ ادا کیا جس کو سن کر اس شخص کے دل میں خیال آیا کہ جس طرح عام طور پر سفر کے دوران راستہ بتانے کے لئے کوئی رہنما ساتھ رکھ لیتے ہیں، اس قسم کے رہنما ساتھ جا رہے ہیں، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دل میں یہ مراد لیا کہ یہ دین کا راستہ دکھانے والے

ہیں، جنت کا راستہ دکھانے والے ہیں، اللہ کا راستہ دکھانے والے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اس موقع پر انہوں نے صریح جھوٹ بولنے سے پرہیز فرمایا۔ بلکہ ایسا لفظ بول دیا جس سے وقتی کام بھی نکل گیا، اور جھوٹ بھی نہیں بولنا پڑا۔

(صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر ۳۹۱۱)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ فکر عطا فرما دیتے ہیں کہ زبان سے کوئی کلمہ خلاف واقعہ اور جھوٹ نہ نکلے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح مدد بھی فرماتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں بڑا حصہ لیا تھا، آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی وغیرہ ان سب حضرات نے اس جہاد میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اب جو لوگ اس جہاد میں شریک تھے، آخر کار انگریزوں نے ان کو پکڑنا شروع کیا۔ چوراہوں پر پھانسی کے تختے لٹکا دیئے۔

؎ جسے دیکھا حاکم وقت نے
کہا یہ بھی صاحب دار ہے

اور ہر ہر محلے میں مجسٹریٹوں کی مصنوعی عدالتیں قائم کر دی تھیں، جہاں کہیں کسی پر شبہ ہوا، اس کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا، اور اس نے حکم جاری کر دیا کہ اس کو پھانسی پر چڑھا دو، پھانسی پر اسکو لٹکا دیا گیا، اسی دوران ایک مقدمہ میرٹھ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بھی قائم ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ کے یہاں پیشی ہو گئی، جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟ اس لئے کہ اطلاع یہ ملی تھی کہ ان کے پاس بندوقیں ہیں، اور حقیقت میں حضرت کے پاس بندوقیں تھیں، چنانچہ جس وقت مجسٹریٹ نے یہ سوال کیا، اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اس کو دکھاتے ہو فرمایا ہمارا ہتھیار یہ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ میرے پاس ہتھیار نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جھوٹ ہو جاتا۔ آپ کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ بالکل درویش صفت معلوم ہوتے تھے،

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد بھی فرماتے ہیں، ابھی سوال جواب ہو رہا تھا کہ اتنے میں کوئی دیہاتی وہاں آگیا، اس نے جب دیکھا کہ حضرت سے اس طرح سوال جواب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا کہ ارے! اس کو کہاں سے پکڑ لائے، یہ تو ہمارے محلے کا موجن (موذن) ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی۔

حضرت نانوتویؒ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ چاروں طرف پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اور آپ چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما ہیں، وہاں پولیس پہنچ گئی، مسجد کے اندر آپ اکیلے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا نام سن کر ذہنوں میں تصور آتا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں تو آپ شاندار قسم کے لباس اور جبہ قبہ پہنے ہونگے، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ تو ہر وقت ایک معمولی لنگی ایک معمولی کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ جب پولیس اندر داخل ہوئی تو یہ سمجھا کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے۔ چنانچہ پولیس نے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں؟ آپ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے، اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، اور اس کے ذریعہ اس کو یہ تاثر دیا کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ لیکن زبان سے یہ جھوٹا کلمہ نہیں نکلا کہ یہاں نہیں ہیں، چنانچہ وہ پولیس واپس چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے وقت میں بھی، جب کہ جان پر بنی ہوئی ہو، اس وقت بھی یہ خیال رہتا ہے کہ زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکلے۔ زبان سے صریح جھوٹ نہ نکلے، اور اگر کبھی مشکل وقت آجائے تو اس وقت بھی توریہ کر کے اور گول مول بات کر کے کام چل جائے، یہ بہتر ہے۔ البتہ اگر جان پر بن جائے، جان جانے کا خطرہ ہو، یا شدید ناقابل برداشت ظلم کا اندیشہ ہو، اور توریہ سے اور گول مول بات کرنے سے بھی بات نہ بنے تو اس وقت شریعت نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن اس اجازت کو اتنی کثرت کے ساتھ استعمال کرنا، جس طرح آج اس کا استعمال ہو رہا ہے، یہ سب حرام ہے، اور اس میں جھوٹی گواہی کا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت

فرمائے۔ آمین۔

بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت

بچوں کے دل میں جھوٹ کی نفرت پیدا کریں، خود بھی شروع سے جھوٹ سے بچنے کی عادت ڈالیں۔ اور بچوں سے اس طرح بات کریں کہ ان کے دلوں میں بھی جھوٹ کی نفرت پیدا ہو جائے، اور سچائی کی محبت پیدا ہو، اس لئے بچوں کے سامنے کبھی غلط بات کوئی جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ باپ جھوٹ بول رہا ہے، ماں جھوٹ بول رہی ہے تو پھر بچے کے دل سے جھوٹ بولنے کی نفرت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ جھوٹ بولنا تو روزانہ کا معمول ہے، اس لئے بچپن ہی سے بچوں میں اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ زبان سے جو بات نکلے، وہ پتھر کی لکیر ہو، اس میں کوئی غلطی نہ ہو، اور نفس الامر کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ دیکھئے، نبوت کے بعد سب سے اونچا مقام "صدیق" کا مقام ہے۔ اور "صدیق" کے معنی ہیں "بہت سچا" جس کے قول میں خلاف واقعہ بات کا شبہ بھی نہ ہو۔

جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے

جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے، بعض اوقات عمل سے بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل کرتا ہے، جو در حقیقت جھوٹا عمل ہوتا ہے، حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

المتشبع بمالم یعط کلابس ثوبی زور

(ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی المتشبع بمالم یعط، حدیث نمبر ۴۹۹۷)

یعنی جو شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسی چیز کا حامل قرار دے جو اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کا لباس پہننے والا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا کہ حقیقت میں نہیں ہے۔ یہ بھی گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص جو حقیقت میں بہت دولت مند نہیں ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی اداؤں سے، اپنی نشست و برخواست سے، اپنے طریق زندگی اپنے آپ کو دولتمند ظاہر

کرتا ہے، یہ بھی عملی جھوٹ ہے، یا اس کے برعکس ایک اچھا خاصا کھاتا پیتا انسان ہے۔ لیکن اپنے عمل سے تکلف کر کے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے، یہ بہت مفلس ہے۔ نادار ہے۔ غریب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ غریب نہیں ہے۔ اس کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی جھوٹ قرار دیا۔ لہٰذا عملی طور پر کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسرے شخص پر غلط تاثر قائم ہو۔ یہ بھی جھوٹ کے اندر داخل ہے۔

اپنے نام کے ساتھ "سید" لکھنا

بہت سے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ایسے الفاظ اور القاب لکھتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتے، چونکہ رواج چل پڑا ہے، اس لئے بلاتحقیق لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ "سید" لکھنا شروع کر دیا۔ جب کہ حقیقت میں "سید" نہیں ہے، اس لئے کہ حقیقت میں "سید" وہ ہے جو باپ کی طرف سے نسب کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ہو، وہ "سید" ہے، بعض لوگ ماں کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوتے ہیں، اور اپنے آپ کو "سید" لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ لہٰذا جب تک "سید" ہونے کی تحقیق نہ ہو، اس وقت تک "سید" لکھنا جائز نہیں، البتہ تحقیق کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اگر خاندان میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ سادات کے خاندان میں ہیں تو پھر "سید" لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر "سید" ہونا معلوم نہیں ہے۔ اور نہ اس کی دلیل موجود ہے، تو اس میں بھی جھوٹ بولنے کا گناہ ہے۔

لفظ "پروفیسر" اور "مولانا" لکھنا

بعض لوگ حقیقت میں "پروفیسر" نہیں ہیں، لیکن اپنے نام کے ساتھ "پروفیسر" لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ "پروفیسر" تو ایک خاص اصطلاح

ہے۔ جو خاص لوگوں کے لئے بولی جاتی ہے۔ یا جیسے "عالم" یا "مولانا" کا لفظ ایسا شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو درس نظامی کا فارغ التحصیل ہو۔ اور باقاعدہ اس نے کسی سے علم حاصل کیا ہو۔ اس کے لئے "مولانا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔، اب بہت سے لوگ جنہوں نے باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا۔ لیکن اپنے نام کے ساتھ "مولانا" لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی خلاف واقعہ ہے، اور جھوٹ ہے ۔ ان باتوں کو ہم لوگ جھوٹ نہیں سمجھتے، اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی گناہ کے کام ہیں۔ اس لئے ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وعدہ خلافی

اور

اس کی مروجہ صورتیں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب :	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
ضبط و ترتیب :	محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت :	۲ر دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ، بعد نماز عصر
مقام :	جامع مسجد بیت المکرّم، گلشن اقبال، کراچی

وعدہ خلافی کی بہت سی صورتیں وہ ہیں جن کو ہم نے وعدہ خلافی کی فہرست سے خارج کر دیا ہے، چنانچہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وعدہ خلافی اچھی چیز ہے؟ تو جواب میں وہ یہی کہے گا کہ یہ تو بہت بری چیز ہے، اور گناہ ہے، لیکن عملی زندگی میں جب موقع آتا ہے وہ وعدہ خلافی کر لیتا ہے۔ اور اسکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعدہ خلافی

اور

اس کی مروجہ صورتیں

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان سیدنا وسندنا وشفیعنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً۔ امابعد!

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان۔ فی روایۃ وان صام وصلی وزعم انہ مسلم

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق، حدیث نمبر ۳۳)

حتی الامکان "وعدہ" کو نبھایا جائے

پچھلے جمعہ کو اس حدیث میں بیان کی گئیں تین علامات میں سے ایک یعنی جھوٹ پر الحمد اللہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہو گیا تھا۔ منافق کی دوسری علامت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ:

"واذا وعد اخلف"

کہ جب وہ وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے، مومن کا کام یہ ہے کہ جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کو نبھاتا ہے، اس کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا، اور بعد میں اس وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی شدید عذر پیش آیا۔ یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی جس کی وجہ سے اس کے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا، تو اس صورت یہ وعدہ کرنے والا شخص اس دوسرے شخص سے بتادے کہ اب میرے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس لئے میں اس وعدہ سے دست بردار ہوتا ہوں، مثلاً ایک شخص نے وعدہ کیا کہ میں تم کو فلاں تاریخ کو ایک ہزار روپے دونگا، بعد میں اس وعدہ کرنے والے کے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس کی مدد کر سکے، اور اس کو ایک ہزار روپے دے سکے، تو اس صورت میں اس کو بتادے کہ میں نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس وعدے کو پورا کر سکوں۔ لیکن جب تک اس وعدہ کو پورا کرنے کی قدرت ہے، اور کوئی شرعی عذر نہیں ہے۔ اس وقت تک اس وعدہ کو پورا کرے۔

"منگنی" ایک وعدہ ہے

مثلاً کسی شخص نے منگنی کرلی، اور کسی سے رشتہ کرنے کے بارے میں طے کر لیا تو یہ منگنی ایک وعدہ ہے۔ اس لئے حتی الامکان اس کو نبھانا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی عذر پیش آجائے۔ مثلاً منگنی کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم نہیں رہے گا، طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق ہے۔ اور کچھ حالات ایسے

سامنے آئے جو پہلے معلوم نہیں تھے۔ اس صورت میں اس کو بتا دے کہ ہم نے آپ سے شادی کا وعدہ اور منگنی کی تھی۔ لیکن اب فلاں عذر کی وجہ سے ہم اس کو پورا نہیں کر سکتے، لیکن جب تک عذر نہ ہو۔ اس وقت تک وعدہ کو نبھانا اور اس وعدہ کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے۔ اور اگر وعدہ پورا نہیں کریگا تو اس حدیث کا مصداق بن جائے گا۔

حضرت حذیفہ کا ابو جہل سے وعدہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ ـــــ اللہ اکبر ـــــ آج اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، مشہور صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کی بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابو جہل اور اس کے لشکر سے ہو گئی، اس وقت ابو جہل اپنے لشکر کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابو جہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا۔ اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں، ابو جہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے، انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور کی ملاقات اور زیارت ہے۔ ہم جنگ میں حصہ نہیں لینگے۔ ابو جہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کرو گے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے، انہوں نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ ابو جہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوہ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہو گئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ "غزوہ بدر"

اب اندازہ لگائیے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوہ بدر) ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان" فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا۔ وہ "بدری" کہلایا، اور صحابہ کرام میں "بدری" صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے۔ اور "اسمائے بدر یین" بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ "بدر یین" جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشن گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر، جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا۔ بخشش فرما دی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابو جہل نے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لینگے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدو کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لینگے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کر لیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دیدیں۔ کہ ہم اس جنگ میں حصہ لیلیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔

(الاصابۃ ج ۱ ص ۳۱٦)

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر

کے آئے ہو، اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جاکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں، جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا۔ وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالت عذر ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں۔ جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اٹھالیے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جارہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے ۔۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا ہے۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ

تقاضہ ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کر دو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے۔ چلو، یہ کام کر لو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے۔ نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ، چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما، دونوں کو غزوہ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفاء۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

اگر آج اس کی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کئے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے ـــ آمین ـــ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے۔ اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ بر سرپیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی، اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا، اور ایک تاریخ متعین کر لی کہ اس تاریخ تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کرینگے، ابھی جنگ بندی کے

معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لیجا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کر دوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی۔ پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا۔ اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دونگا۔ اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دوں گا تو جلدی فتح حاصل ہو جائیگی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ اب پیچھے سے ایک گھوڑا سوار دوڑتا چلا آرہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المومنین کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھوڑا سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، قفوا عباد اللہ قفوا عباد اللہ"

اللہ کے بندو ٹھیر جاؤ، اللہ کے بندو، ٹھیر جاؤ، جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ:

"وفاء لا غدر، وفاء لا غدر"

مومن کا شیوہ وفاداری ہے۔ غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے۔ میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، حضرت عمر بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر چہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دیں۔ اور فوج کا کچھ حصہ سرحد سے اندر بھی داخل کر دیا تھا۔ اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی، اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلنہ ولا یشدنہ الی ان یمضی اجل لہ اوینبذ الیھم علی سواء۔

(ترمذی، کتاب الجھاد، باب فی الغدر، حدیث نمبر ۱۵۸۰)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے، اور نہ باندھے۔ یہاں تک اس کی مدت نہ گزر جائے۔ یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کر دے کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا، لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کئے بغیر ان کے علاقے کے پاس لیجا کر فوجوں کو ڈال دینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگائیے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جارہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہدہ کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے۔ اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیدیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے۔ وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا، اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیش نظر نہیں تھا۔ کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی۔ بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو

راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس لئے واپس لوٹ گئے ــــ یہ ہے وعدہ، کہ جب زبان سے بات نکل گئی، تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے سے تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے ــ "جزیہ" ایک ٹیکس ہوتا ہے، جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے ــــ چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز تو بہت اچھی ہے، اور فوجیں وہاں سے اٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو۔ وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں۔ ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کیلئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی۔ لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لیجائیں گے۔ اور اب آپ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں ــــ یہ مثالیں ہیں، اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ جس نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

وعدہ خلافی کی مروجہ صورتیں

بہر حال، منافق کی دوسری علامت جو اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ وعدہ کی خلاف ورزی اور وعدہ کو توڑنا ایک منافق کی نشانی ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہئے لیکن جیسے میں نے جھوٹ کے بارے میں پچھلے جمعہ کو عرض کیا تھا کہ جھوٹ کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں، جن کو ہم اور آپ نے بالکل شیرمادر سمجھ لیا ہے، اور ان کو جھوٹ کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ ان کو جھوٹ سمجھتے ہی نہیں ہے، اسی طرح وعدہ خلافی کی بھی بعض صورتیں وہ ہیں۔ جن کو وعدہ خلافی کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وعدہ خلاف اچھی چیز ہے؟ تو جواب میں وہ یہی کہے گا کہ یہ تو بہت بری چیز اور گناہ ہے، لیکن عملی زندگی میں جب موقع آتا ہے تو اس وقت وہ وعدہ خلافی کر لیتا ہے۔ اور اس کو وعدہ خلافی سمجھتا ہی نہیں کہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

ملکی قانون کی پابندی کرنا واجب ہے

مثلاً ایک بات عرض کرتا ہوں، جس کی طرف عام لوگوں کو توجہ نہیں ہے، اور اس کو دین کا معاملہ نہیں سمجھتے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ــ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "وعدہ" صرف زبانی نہیں ہوتا۔ بلکہ وعدہ عملی بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ملک میں بطور باشندے کے رہتا ہے تو وہ شخص عملاً اس حکومت سے وعدہ کرتا ہے کہ میں آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اب اس شخص پر اس وعدے کی پابندی کرنا واجب ہے، جب تک اس ملک کا قانون اس کو کسی گناہ کرنے پر مجبور نہ کرے، اس لئے کہ اگر کوئی قانون اس کو گناہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو پھر اس قانون پر عمل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ:

لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق

یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں

(مصنف ابن ابی شیبۃ ج ۱۲ ص ۵۴۶)

لہٰذا ایسے قانون کی پابندی نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں، لیکن اگر کوئی قانون ایسا ہے جو آپ کو گناہ اور معصیت پر مجبور نہیں کر رہا ہے، اس قانون کی پابندی اس لئے واجب ہے کہ آپ نے عملاً اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کرونگا

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے، اور نبی بننے سے پہلے ایک قبطی کو مکا مار کر قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے، اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے، اور فرماتے کہ: لهم علی ذنب (سورة الشعراء: ۱۴)

یعنی میرے اوپر ان کا ایک گناہ ہے، اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ مُکا مارنے سے وہ مر جائیگا اسلئے یہ حقیقۃً گناہ نہیں تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا۔ لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اسلئے آپنے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبطی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ وہ تو کافر تھا، اور کافر بھی حربی تھا، لہذا اگر اُسے جان بوجھ کر بھی قتل کرتے تو اس حربی کافر کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اسلئے گناہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کرینگے، اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قانون کی پابندی کریگا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

"ویزا" لینا ایک عملی وعدہ ہے

اسی طرح جب آپ ویزہ لے کر دوسرے ملک جاتے ہیں۔ چاہے وہ غیر مسلم ملک ہو۔ مثلاً ہندوستان، امریکہ یا یورپ ویزہ لے کر چلے گئے، یہ ویزہ لینا عملاً ایک وعدہ ہے کہ ہم حتی الامکان اس ملک کے قوانین کی پابندی کرینگے، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، ہاں اگر وہ قانون گناہ پر مجبور کرے تو پھر اس قانون کی پابندی جائز نہیں۔ لہٰذ جو قوانین ایسے ہیں، جو انسان کو کسی گناہ پر مجبور نہیں کرتے، یا ناقابل برداشت ظلم کا سبب نہیں بنتے، ان قوانین کی پابندی بھی وعدہ کی پابندی میں داخل ہے۔

ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی گناہ ہے

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے کہ دائیں طرف چلو، یا بائیں طرف چلو، یا یہ قانون ہے کہ جب سگنل کی لال بتی جلے تو رک جاؤ، اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو، اب ایک شہری ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کرونگا، لہٰذا اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی نہ کرے، تو یہ وعدہ خلافی ہے۔ اور گناہ ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرلی تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا سیانہ اور ہوشیار جتانے کے لئے خلاف ورزی بھی کر رہا ہے، اور قانون کی گرفت میں بھی نہیں آرہا ہے۔

دنیا و آخرت کے ذمہ دار آپ ہونگے

یاد رکھئے، یہ کئی اعتبار سے گناہ ہے، ایک تو اس حیثیت سے گناہ ہے کہ یہ وعدہ کی خلاف ورزی ہے، دوسرے اس حیثیت سے بھی گناہ ہے یہ قوانین تو اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ نظم و ضبط پیدا ہو، اور اس کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے راستے بند ہوں لہٰذا اگر آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی، اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا، تو اس نقصان کی دنیا و آخرت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی،

یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے

یہ سب باتیں اس لئے بتارہا ہوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو دنیاداری کی باتیں ہیں۔ ان کی پابندی کی کیا ضرورت ہے؟ خوب سمجھ لیجئے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین ہے، جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے، اور دین داری صرف ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں ہے خلاصہ یہ ہے کہ جو قانون کسی گناہ پر مجبور کرے۔ اس کی تو کسی حال میں بھی اطاعت جائز نہیں، اور جو قانون ناقابل برداشت ظلم کرے، اس کی بھی پابندی نہیں کرنی ہے، لیکن اس کے علاوہ جتنے قوانین ہیں ان کی پابندی شرعاً بھی ہمارے ذمے واجب ہے، اگر ان کی پابندی نہیں کرینگے تو وعدہ خلافی کا گناہ ہو گا۔

خلاصہ

لہٰذا بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی سمجھتے ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں۔ جن کو ہم وعدہ خلافی نہیں سمجھتے، مگر وہ وعدہ خلافی اور گناہ کے اندر داخل ہیں۔ ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے، دین ہماری زندگی کے ہر شعبے کے اندر داخل ہے۔ ان تمام چیزوں کا لحاظ نہ کرنا دین کے خلاف ہے۔

منافق کی دو علامتوں کا بیان ہو گیا، تیسری علامت ہے "امانت میں خیانت" اس کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ اس کی اہمیت اور فضیلت تو اپنی جگہ ہے، مگر بے شمار کام ایسے ہیں جو "خیانت" کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان کو خیانت نہیں سمجھتے، اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو اگلے جمعہ اس کے بارے عرض کرونگا، جو باتیں ہم نے کہیں اور سنیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خیانت
اور اس کی مروجہ صورتیں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت : ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ، بعد نماز عصر
مقام : جامع مسجد بیت المکرّم، گلشن اقبال، کراچی

سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس موجود ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ انسان کا وجود اور اس کی زندگی ہے اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اس کے اوقات ہیں، کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں ان اعضاء آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ پاؤں کا مالک ہوں؟ اور جس طرح چاہوں ان کو استعمال کروں؟ ایسا نہیں، بلکہ یہ تمام اعضاء اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لئے عطا فرمائے ہیں، لہٰذا اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے اس وجود کو، ان اعضاء کو اپنی صلاحیتوں کو، اپنی توانائیوں کو صرف اسی کام میں استعمال کریں، جس کام کے لئے یہ دی گئی ہیں اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں گے تو یہ خیانت ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خیانت
اور
اس کی مروجہ صورتیں

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و اشھد ان سیدنا و سندنا وشفیعنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً۔ امابعد:

"عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب. واذا وعد اخلف. واذا اؤتمن خان. فی روایۃ وان صام وصلی وزعم انہ مسلم

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق، حدیث نمبر ۳۳)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائیں

ہیں، اور اشارہ اس بات کی طرف فرمادیا کہ یہ تین کام مومن کے کام نہیں ہیں، اور جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں، وہ صحیح معنی میں مسلمان اور مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ ان میں سے دو کا بیان پچھلے دو جمعوں میں ۔ الحمد للہ ۔ قدرے تفصیل کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

امانت کی تاکید

منافق کی تیسری علامت جو بیان فرمائی، وہ ہے "امانت میں خیانت" یعنی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے، بلکہ یہ منافق کا کام ہے۔ بہت سی آیات اور احادیث میں امانت پر زور دیا گیا ہے، اور امانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا

(۵۸: سورۃ النساء)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے اہل تک اور ان کے مستحقین تک پہنچاؤ، اور اس کی اتنی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ

(مسند احمد۔ ج ۳ - ص: ۱۳۵)

یعنی جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان بھی نہیں۔ گویا کہ ایمان کالازمی تقاضہ ہے کہ آدمی امین ہو۔ امانت میں خیانت نہ کرتا ہو۔

امانت کا تصور

لیکن آج کی مجلس میں جس بات کی طرف توجہ دلانی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ان تمام چیزوں کا مطلب اور مفہوم بہت محدود سمجھا ہوا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں امانت کا صرف اتنا تصور ہے کہ کوئی شخص پیسے لے کر آئے۔ اور یہ کہے کہ یہ پیسے آپ

بطور امانت اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جب ضرورت ہوگی اس وقت میں آپ سے واپس لے لوں گا۔ تو یہ امانت ہے۔ اور اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتے ہوئے ان پیسوں کو کھاکر ختم کر دے۔ یا جب وہ شخص اپنے پیسے مانگنے آئے تو اس کو دینے سے انکار کر دے تو یہ خیانت ہوئی۔ ہمارے ذہنوں میں امانت اور خیانت کا بس اتنا ہی تصور ہے۔ اس سے آگے نہیں ہے۔ بیشک یہ بھی امانت میں خیانت کا حصہ ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کی اصطلاح میں "امانت" اس حد تک محدود نہیں، بلکہ "امانت" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور بہت ساری چیزیں امانت میں داخل ہیں، جن کے بارے میں اکثر و بیشتر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بھی امانت ہے۔ اور اس کے ساتھ "امانت" جیسا سلوک کرنا چاہئے۔

امانت کے معنی

عربی زبان میں "امانت" کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کو اس طرح سپرد کی گئی ہو، کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، یہ ہے امانت کی حقیقت، لہٰذا کوئی شخص کوئی کام یا کوئی چیز یا کوئی مال جو دوسرے کے سپرد کرے، اور سپرد کرنے والا اس بھروسے پر سپرد کرے کہ یہ شخص اس سلسلے میں اپنے فریضے کو صحیح طور پر بجالائے گا۔ اور اس میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ یہ امانت ہے۔ لہٰذا "امانت" کی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بیشمار چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔

یوم الست میں اقرار

اللہ تعالیٰ نے "یوم الست" میں انسانوں سے جو عہد لیا تھا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں یا نہیں؟ اور تم میری اطاعت کرو گے یا نہیں؟ تمام انسانوں نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اس عہد کو قرآن کریم نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں امانت سے تعبیر فرمایا ہے، فرمایا کہ:

انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابين ان يحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه كان ظلومًا جهولاه

(۷۲ الاحزاب)

یعنی ہم نے زمین پر امانت پیش کی، اور اس سے پوچھا کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گی؟ تو اس نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر آسمانوں پر پیش کی کہ تم یہ امانت اٹھاؤ گے؟۔ انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور پھر پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ سب اس امانت کو اٹھانے سے ڈر گئے۔ لیکن جب یہ امانت اس حضرت انسان پر پیش کی گئی تو یہ بڑے بہادر بن کر آگے بڑھ کر اقرار کر لیا کہ میں اس امانت کو اٹھاؤں گا۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا کہ اتنے بڑے بوجھ کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھ گیا، اور یہ نہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے عاجز رہ جاؤں، جسکی وجہ سے میرا انجام خراب ہو جائے۔

یہ زندگی امانت ہے

بہر حال، اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے "امانت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ امانت کیا چیز تھی جو انسان پر پیش کی جا رہی تھی؟ چنانچہ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں امانت کے معنی یہ ہیں کہ اس انسان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ تمہیں ایک زندگی دی جائے گی، اور اس میں تمہیں اچھے کام کرنے کا بھی اختیار دیا جائے گا۔ اور برے کام کرنے کا بھی، اور جب اچھے کام کرو گے تو ہماری خوشنودی حاصل ہوگی، جنت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تمہیں حاصل ہوں گی۔ اور اگر برے کام کرو گے تو اس کے نتیجے میں تم پر ہمارا غضب ہو گا، اور جہنم کا ابدی عذاب تم پر ہو گا، اب بتاؤ تمہیں ایسی زندگی منظور ہے یا نہیں؟ چنانچہ اور سب نے انکار کر دیا، لیکن انسان اس کے لئے تیار ہو گیا، حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو بیان فرماتے ہیں کہ ۔

آسمان بار امانت نتو اند کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زد

یعنی آسمان سے تو یہ بوجھ نہیں اٹھا، اس نے تو انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ حضرت انسان، مشت استخوان نے یہ بوجھ اٹھالیا، اور قرعہ فال میرے نام پر پڑ گیا۔ بہر حال! قرآن کریم نے اس کو "امانت" سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ جسم ایک امانت ہے

یہ پوری زندگی ہمارے پاس امانت ہے اور اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق گزار دیں، لہٰذا سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ امانت خود اس کا "وجود" اور اس کی "زندگی" اور اس کے اعضاء و جوارح، اس کے اوقات، اس کی توانائیاں ہیں، یہ سب کی سب امانت ہیں، کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کا مالک ہوں، یہ آنکھ جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کا مالک ہوں، ایسا نہیں، بلکہ یہ سارے اعضا ہمارے پاس امانت ہیں، ہم اس کے مالک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں، بلکہ اعضا کی یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لئے عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان اعضا کو، اپنے اس وجود کو، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنی توانائیوں کو اسی کام میں صرف کریں، جس کام کے لئے یہ دی گئی ہیں، اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ ایک نعمت ہے

مثلاً آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے اور یہ ایسی نعمت ہے کہ ساری دنیا کی مال و دولت خرچ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہے تو حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس کی قدر اس لئے نہیں ہے کہ پیدائش کے وقت سے یہ سرکاری مشین لگی ہوئی ہے۔ اور کام کر رہی ہے، اس کے حاصل کرنے میں نہ تو کوئی پیسہ لگا ہے، اور نہ محنت کرنی پڑی ہے، لیکن جس دن ــ خدانہ کرے ــ اس آنکھ کی بینائی پر ادنیٰ سا نقص آجائے، اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں میری یہ بینائی نہ چلی جائے، اس وقت

اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت آدمی ساری دولت ایک آنکھ کی بینائی کے لئے خرچ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایسی سرکاری مشین ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے، نہ اس کی آور ہالنگ کی ضرورت۔ نہ اس کا ماہانہ خرچ، نہ ٹیکس، نہ کرایہ، بلکہ مفت ملی ہوئی ہے۔

آنکھ ایک امانت ہے۔

لیکن یہ مشین اللہ تعالیٰ نے بطور امانت کے دے رکھی ہے، اور یہ فرمادیا ہے کہ اس مشین کو استعمال کرو، اس کے ذریعہ دنیا کو دیکھو، دنیا کا نظارہ کرو، دنیا کے مناظر سے لطف اٹھاؤ، سب کچھ کرو، لیکن صرف چند چیزوں کو دیکھنے سے منع کر دیا کہ اس سرکاری مشین کو ان کاموں میں استعمال نہ کریں مثلاً حکم دے دیا کہ اس کے ذریعہ نامحرم پر نگاہ نہ ڈالی جائے، اب اگر اس کے ذریعہ ہم نے نامحرم کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔ اسی لئے قرآن کریم نے نامحرم کی طرف نگاہ کرنے کو خیانت سے تعبیر فرمایا، چنانچہ فرمایا کہ:

يعلم خائنة الاعين (۹ : غافر)

یعنی آنکھوں کی خیانت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم نے اس کو ایسی جگہ استعمال کیا جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا، یہ ایسا ہے جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے پاس اپنا مال بطور امانت رکھوایا، اور اب وہ چوری چھپے آنکھ بچاکر اس کا مال استعمال کرنا چاہتا ہے، وہی معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ بھی کرتا ہے، اور بے وقوف کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عمل چھپ نہیں سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی خیانت کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر وعیدیں بیان فرمائیں۔

اور اگر آنکھ کی اس امانت اور نعمت کو صحیح جگہ استعمال کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک شخص باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا۔ اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ اس

نے اس امانت کو صحیح جگہ پر استعمال کیا، اگرچہ اپنی ذاتی لذت کے لئے اپنے فائدے کیلئے کیا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا۔ اس لئے ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔

"کان" ایک امانت ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے کان سننے کے لئے عطا فرمایا ہے، اور پھر ہر چیز سننے کی اجازت دے دی، صرف چند چیزوں پر پابندی لگا دی کہ تم گانا بجانا مت سننا، موسیقی مت سننا، غیبت مت سننا، غلط اور جھوٹی باتیں مت سننا، لہٰذا اگر کان ان چیزوں کے سننے میں استعمال ہو رہا ہے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

زبان ایک امانت ہے۔

"زبان" اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو پیدائش کے وقت سے چل رہی ہے، اور مرتے دم تک چلتی رہتی ہے، زبان کی ذرا سی حرکت سے نہ جانے کیا کیا کام انسان لے رہا ہے، یہ زبان اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان کو حرکت دے کر یہ کہہ دو:

سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

حدیث شریف میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے میزان عمل کا آدھا پلڑا بھر جاتا ہے، اس لئے اس کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہئے، لیکن اگر اس زبان کو جھوٹ بولنے میں استعمال کیا۔ غیبت کرنے میں استعمال کیا۔ مسلمان کی دل آزاری کرنے میں استعمال کیا۔ دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں استعمال کیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

خود کشی کیوں حرام ہے

یہ تو صرف اعضاء کی بات تھی۔ ہمارا یہ پورا وجود، پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اسی لئے شریعت میں

خود کشی کرنا حرام ہے۔ اگر یہ جسم ہمارا اپنا ہوتا تو خود کشی کیوں حرام ہوتی۔ وہ اس لئے حرام ہے کہ یہ جان، یہ جسم، یہ وجود، یہ اعضاء، حقیقت میں ہماری ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

مثلاً یہ کتاب میری ملکیت ہے۔ اب اگر میں کسی شخص سے کہوں کہ یہ کتاب تم لے جاؤ۔ میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ مجھے قتل کر دو، میری جان لے لو، اب اس نے قتل کرنے کی اجازت دے دی۔ اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیا۔ دستخط کر دیئے مہر بھی لگادی۔ سب کچھ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود جس کو قتل کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے لئے قتل کرنا جائز نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ جان اس کی ملکیت ہی نہیں ہے۔ اگر اس کی ملکیت ہوتی، تب وہ دوسرے کو اس کے لینے کی اجازت دے سکتا تھا، لہٰذا جب ملکیت نہیں، تو پھر دوسرے کو اجازت دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

گناہ کرنا خیانت ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ پورا وجود، پوری جان، اور یہ صلاحیتیں اور توانائیاں یہ سب ہمیں امانت کے طور پر عطا فرمائیں ہیں، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ پوری زندگی امانت ہے، اس لئے زندگی کا کوئی کام، اور ان اعضاء سے کیا جانے والا کوئی عمل، کوئی قول، کوئی فعل ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس امانت میں خیانت کا سبب بنے، لہٰذا امانت کا جو محدود تصور ہمارے ذہنوں میں ہے کہ کوئی شخص آکر پیسے رکھوائے گا، اور ہم صندوقچی کھول کر اس میں وہ پیسے رکھیں گے، اور تالہ لگادیں گے، اب اگر ان پیسوں کو نکال کر خرچ کر لیا تو یہ خیانت ہوگی۔ امانت کا اتنا محدود تصور غلط ہے۔ بلکہ یہ پوری زندگی ایک امانت ہے۔ اور زندگی کا ایک ایک قول و فعل امانت ہے۔

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ امانت میں خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو، یا کان کا گناہ ہو، یا زبان کا گناہ ہو، یا کسی اور عضو کا گناہ ہو، وہ سارے امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اور وہ مومن کے کام نہیں ہیں۔ بلکہ منافق کے کام ہیں۔

"عاریت" کی چیز امانت ہے

یہ تو امانت کے بارے میں عام باتیں تھیں۔ لیکن امانت کے کچھ خاص خاص شعبے بھی ہیں، بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے، اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے۔ مثلاً "عاریت" کی چیز ہے، "عاریت" اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک چیز کی ضرورت تھی۔ وہ چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اس نے وہ چیز استعمال کرنے کے لئے دوسرے سے مانگ لی کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، تھوڑی دیر کے لئے دے دو، اب یہ "عاریت" کی چیز "امانت" ہے۔ مثلاً میرا ایک کتاب پڑھنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن وہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، اس لئے میں نے دوسرے شخص سے پڑھنے کے لئے وہ کتاب مانگ لی کہ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، اب یہ کتاب میرے پاس "عاریت" ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو عاریت کہا جاتا ہے، اور یہ عاریت کی چیز امانت ہوتی ہے، لہٰذا اس لینے والے شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ اس عاریت کی چیز کو اس طرح استعمال نہ کرے، جس سے مالک کو تکلیف ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کو بروقت مالک کے پاس لوٹانے کی فکر کرے۔

یہ برتن امانت ہیں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے بیشمار مواعظ میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ لوگ بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کے گھر کسی نے کھانا بھیج دیا، اس بیچارے بھیجنے والے سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے آپ کے گھر کھانا بھیج دیا، اب صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کھانا تم دوسرے برتن میں نکال لو، اور وہ برتن اس کو فوراً واپس کر دو، مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ بیچارہ کھانا بھیجنے والا برتن سے بھی محروم ہو گیا، چنانچہ وہ برتن گھر میں پڑے ہوئے ہیں، واپس پہنچانے کی فکر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان برتنوں کو خود اپنے استعمال میں لانے شروع کر دیئے، یہ امانت میں خیانت ہے، اس لئے کہ وہ برتن آپ کے پاس بطور عاریت کے آئے تھے، آپ کو ان کا مالک نہیں بنایا گیا تھا، لہٰذا ان برتنوں کو استعمال کرنا، اور ان کو واپس پہنچانے کی فکر نہ کرنا امانت میں

خیانت ہے۔

یہ کتاب امانت ہے

یا مثلاً آپ نے کسی سے کتاب پڑھنے کے لئے لے لی، اور کتاب پڑھ کر اس کو مالک کے پاس واپس نہیں پہنچائی یہ امانت میں خیانت ہے، حتیٰ کہ اب تو لوگوں میں یہ مقولہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ "کتاب کی چوری جائز ہے" اور جب کتاب کی چوری جائز ہو گئی تو امانت میں خیانت بطریق اولیٰ جائز ہو گی۔ اگر کسی نے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دے دی تو اب لوٹانے کا کوئی سوال نہیں، حالانکہ یہ سب باتیں امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں۔ اسی طرح جتنی عاریت کی چیزیں ہیں، جو آپ کے پاس کسی بھی طریقے سے آئی ہوں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا، اور ان کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا واجب اور فرض ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ایک شخص نے کہیں ملازمت کر لی۔ اور ملازمت میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا معاہدہ ہو گیا، یہ آٹھ گھنٹے آپ نے اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے، لہٰذا یہ آٹھ گھنٹے کے اوقات آپ کے پاس اس شخص کی امانت ہے جس کے یہاں آپ نے ملازمت کی ہے۔ لہٰذا اگر ان آٹھ گھنٹوں میں سے ایک منٹ بھی آپ نے کسی ایسے کام میں صرف کر دیا، جس میں صرف کرنے کی مالک کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ تو یہ امانت میں خیانت ہے، مثلاً ڈیوٹی کے اوقات میں دوست احباب ملنے کے لئے آگئے اب ان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ وقت اس میں صرف ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ وقت تمہارا بکا ہوا تھا۔ تمہارے پاس امانت تھا، تم نے اس وقت کو باتوں میں اور ہنسی مذاق میں گزار دیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

اب بتائیے، ہم لوگ کتنے غافل ہیں کہ جو اوقات ہمارے بکے ہوئے ہیں، ہم ان کو دوسرے کاموں میں صرف کر رہے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہو رہی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ مل ر[illegible] وہ پوری طرح حلال نہیں ہوئی، اس

لئے کہ وقت پورا نہیں دیا۔

دارالعلوم دیو بند کے اساتذہ کا معمول

دارالعلوم دیو بند کے حضرات اساتذہ کرام کو دیکھئے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ صحابہ کرام کے دور کی یادیں تازہ کرائیں، ان حضرات اساتذہ کرام کی تنخواہ ۱۰ روپے ماہانہ یا پندرہ روپے ماہانہ ہوتی تھی، لیکن چونکہ جب تنخواہ مقرر ہو گئی، اور اپنے اوقات مدرسے کے ہاتھ فروخت کر دیئے، اس لئے ان حضرات اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات کے دوران مہمان یا دوست احباب ملنے کے لئے آتے تو جس وقت وہ مہمان آتے فوراً گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ اور پھر ان کو جلد از جلد نمٹانے کی فکر کرتے۔ اور جس وقت وہ مہمان چلے جاتے، اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ پورا مہینہ اس طرح وقت نوٹ کرتے رہتے پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا تو وہ اساتذہ باقاعدہ درخواست دیتے کہ اس ماہ کے دوران ہم نے اتنا وقت مدرسے کے کام کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کیا ہے۔ لہٰذا براہ کرم میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کے پیسے کاٹ لئے جائیں، وہ حضرات اساتذہ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ اگر ہم نے اس وقت کی تنخواہ لے لی وہ تنخواہ ہمارے لئے حرام ہو گئی۔ اس لئے واپس کر دیتے۔ آج تنخواہ لینے کے لئے تو درخواستیں دی جاتی ہیں۔ تنخواہ کٹوانے کے لئے درخواست دینے کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ، جو دارالعلوم دیو بند کے پہلے طالب علم ہیں، جن کے ذریعہ دارالعلوم دیو بند کا آغاز ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم میں، تقویٰ میں، معرفت میں، بہت اونچا مقام بخشا تھا۔ جس زمانے میں آپ دارالعلوم دیو بند میں شیخ الحدیث تھے، اس وقت آپ کی تنخواہ ماہانہ دس روپے تھی، پھر جب آپ کی عمر زیادہ ہو گئی اور تجربہ بھی زیادہ ہو گیا، تو اس وقت دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ نے یہ

طے کیا کہ حضرت والا کی تنخواہ بہت کم ہے۔ جبکہ آپ کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ ضروریات بھی زیادہ ہیں، مشاغل بھی زیادہ ہیں، اس لئے تنخواہ بڑھانی چاہئے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اب آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے ماہانہ کر دی جائے، جب تنخواہ تقسیم ہوئی تو حضرت والا نے دیکھا کہ اب دس کے بجائے پندرہ روپے ملے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ یہ پندرہ روپے مجھے کیوں دیئے گئے۔ لوگوں نے بتایا کہ مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی جائے، آپ نے وہ تنخواہ لینے سے انکار کر دیا، اور دارالعلوم دیو بند کے مہتمم صاحب کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضرت! آپ نے میری تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی ہے۔ حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، پہلے تو میں نشاط کے ساتھ دو تین گھنٹے سبق پڑھالیتا تھا۔ اور اب تو میں کم پڑھاتا ہوں۔ وقت کم دیتا ہوں۔ لہٰذا میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا جو اضافہ آپ حضرات نے کیا ہے یہ واپس لیا جائے۔ اور میری تنخواہ اسی طرح دس روپے کر دی جائے۔

لوگوں نے آکر حضرت والا سے منت سماجت شروع کر دی کہ حضرت! آپ تو اپنے تقویٰ اور ورع کی وجہ سے اضافہ واپس کر رہے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے یہ مشکل ہو جائے گی کہ آپ کی وجہ سے ان کی ترقیاں رک جائیں گی۔ لہٰذا آپ اس کو منظور کر لیں۔ مگر انہوں نے اپنے لئے اس کو گوارا نہ کیا، کیوں؟ اس لئے کہ ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ یہ دنیا تو چند روز کی ہے۔ خدا جانے آج ختم ہو جائے۔ یا کل ختم ہو جائے۔ لیکن یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، کہیں یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر وہاں شرمندگی کا سبب نہ بن جائے۔

دارالعلوم دیو بند عام یونیورسٹی کی طرح نہیں تھا کہ استاذ نے سبق پڑھا دیا۔ اور طالب علم نے سبق پڑھ لیا۔ بلکہ وہ ان اداؤں سے دارالعلوم دیو بند بنا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر سے بنا ہے۔ اس ورع اور تقویٰ سے بنا ہے۔ لہٰذا یہ اوقات جو ہم نے بیچ دیئے ہیں۔ یہ امانت ہیں۔ اس میں خیانت نہ ہونی چاہئے۔

آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے

آج سارا زور حقوق کے حاصل کرنے پر ہے، حقوق حاصل کرنے کے لئے جلوس اور جلسے ہو رہے ہیں، نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ اور اس بات پر احتجاج ہو رہا ہے کہ ہمیں ہمارا حق دو، ہر شخص یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق دو۔ لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسروں کے حقوق جو مجھ پر عائد ہو رہے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ آج یہ مطالبہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہئے۔ مجھے ترقی ملنی چاہئے، یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی چھٹیاں ملنی چاہئیں، مجھے اتنا الاؤنس ملنا چاہئے۔ لیکن جو فرائض مجھے سونپے گئے ہیں۔ وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اس کی کوئی فکر نہیں۔

ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری یہ ذہنیت برقرار رہے گی کہ میں دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں، اور مجھ سے کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے، میں اپنے فرائض سے غافل رہوں، اور دوسروں سے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں۔ یاد رکھو! اس وقت تک دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں ہو گا۔ حق ادا ہونے کا صرف ایک راستہ ہے، جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے، میرے ذمہ جو فریضہ ہے، میں اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب اس بات کا احساس دل میں ہو گا تو پھر سب کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ اگر شوہر کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے بیوی کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کر دوں، بس بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ بیوی کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے شوہر کے جو فرائض ہیں۔ میں ان کو ادا کر دوں۔ بس شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ مزدور کے دل میں یہ احساس ہو کہ مالک کے میرے ذمے جو فرائض ہیں۔ میں ان کو ادا کر دوں، مالک کا حق ادا ہو گیا۔ اور مالک کے دل میں یہ احساس ہو کہ مزدور کے میرے ذمے جو حقوق ہیں، وہ میں ادا کر دوں، مزدور کا حق ادا ہو گیا۔ جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہو گا۔ اس وقت تک حقوق کے مطالبے کے صرف نعرے ہی لگتے رہیں گے اور تحفظ حقوق کی انجمنیں ہی

قائم ہوتی رہیں گی۔ اور جلسے جلوس نکلتے رہیں گے، لیکن اس وقت تک کسی کا حق ادا نہ ہو گا، جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس کے حقوق کا جواب دینا ہے۔ بس دنیا میں امن و سکون کا یہی راستہ ہے۔ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے

لہٰذا یہ اوقات ہمارے پاس امانت ہیں، قرآن کریم نے فرمایا کہ:

ویل للمطففین ○ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ○
واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ○

(المطففین: ۳)

فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جب دوسروں سے وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورا پورا وصول کرتے ہیں۔ تاکہ ذرا بھی کمی نہ ہو جائے، لیکن جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو اس میں کم دیتے ہیں اور ڈنڈی مارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے ــــ اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی اس وقت ہوتی ہے۔ جب آدمی کوئی سودا بیچے، اور اس میں ڈنڈی مار جائے، حالانکہ علماء نے فرمایا کہ:

"التطفیف فی کل شئ"

یعنی ناپ تول میں کمی ہر چیز میں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے۔ اور وہ پورے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں دے رہا ہے، وہ بھی ناپ تول میں کمی کر رہا ہے۔ اور اس عذاب کا مستحق ہو رہا ہے، اس کا لحاظ کرنا چاہئے۔

"منصب" اور "عہدہ" ذمہ داری کا پھندا

آج ہم پر یہ بلا جو مسلط ہے کہ اگر کسی کو سرکاری دفتر میں کوئی کام پڑ جائے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، اس کا کام آسانی سے نہیں ہوتا، بار بار دفتروں کے چکر

لگانے پڑتے ہیں، کبھی افسر صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کام نہیں ہو سکتا کل کو آنا، جب دوسرے دن پہنچے تو کہا کہ پرسوں آنا، چکر پر چکر لگوائے جارہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے فرض کا احساس اور امانت کا احساس ختم ہو گیا ہے، اگر کسی کے پاس کوئی منصب ہے تو وہ کوئی منفعت نہیں ہے۔ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ وہ ذمہ داری کا ایک پھندا ہے، حکومت، اقتدار، منصب، عہدہ یہ سب ذمہ داری کے پھندے ہیں، یہ ایسی ذمہ داری ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مر جائے تو مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال نہ ہو جائے کہ اے عمر! تیرے عہد خلافت میں فلاں کتا بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔

کیا ایسے شخص کو خلیفہ بنا دوں؟

روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور آپ شدید زخمی ہو گئے تو کچھ صحابہ کرام آپ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا کہ حضرت آپ دنیا سے تشریف لے جارہے ہیں، آپ اپنے بعد کسی کو خلیفہ اور جانشین نامزد فرما دیں، تاکہ آپ کے بعد وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لے، اور بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمر کو نامزد فرما دیں تاکہ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہلے تو جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۱۳)

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض یعنی ماہواری کے ایام میں طلاق دیدی تھی، اور مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت ایام کی حالت میں ہو، اس وقت عورت کو طلاق دینا شرعاً ناجائز ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ غلط

کیا، اس لئے اب رجوع کر لو، اور پھر سے اگر طلاق دینی ہو تو پاکی کی حالت میں طلاق دینا ...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتے ہو جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۱۳ و تاریخ الطبری ۳: ۲۹۲)

حضرت عمر اور احساس ذمہ داری

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو دوسرا جواب یہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ خلافت کے بوجھ کا پھندا خطاب کی اولاد میں اسے ایک شخص کے گلے میں پڑ گیا تو یہ بھی کافی ہے، مراد اپنی ذات تھی کہ بارہ سال تک یہ پھندا میرے گلے میں پڑا رہا۔ وہی کافی ہے۔ اب اس خاندان کے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس واسطے کہ کچھ پتہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جب مجھے اس ذمہ داری کا حساب دینا ہو گا، اس وقت میرا کیا حال ہو گا...... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی یہ خوشخبری سن چکے ہیں کہ: "عمر فی الجنة" کہ عمر جنت میں جائے گا۔ اس بشارت کے بعد اس بات کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا کہ جنت میں نہ جائیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب کا ڈر اور اس امانت کا اتنا احساس ہے۔

(تاریخ الطبری ج ۳ صفحہ ۲۹۲)

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اگر میں اس امانت کے حساب کے نتیجے میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں کہ میرے اوپر نہ کوئی گناہ ہو، اور نہ ثواب ہو اور مجھے "اعراف" میں بھیج دیا جائے (جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک علاقہ ہے جس میں ان لوگوں کو رکھا جائے گا، جن کے گناہ اور ثواب برابر ہوں گے) تو میرے لئے یہ بھی کافی، اور میں خلاصی پا جاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے اس امانت کا احساس جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، اگر اس احساس کا تھوڑا ذرہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے تو ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں۔

پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک "خیانت" ہے

ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک کیا ہے؟ یعنی سب سے بڑی مشکل کیا ہے جس کو حل کرنے میں اولیت دی جائے حقیقت میں مسئلہ نمبر ایک "خیانت" ہے آج امانت کا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ اپنے فرائض ادا کرنے کا احساس دل سے اتر گیا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس باقی نہیں رہا، زندگی تیزی سے چلی جارہی ہے۔ جس میں پیسے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کھانے کی دوڑ لگی ہے، اقتدار کی دور ہے۔ اس دوڑ میں ایک دوسرے سے سے بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں، آج سب سے بڑا مسئلہ، اور ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کے اندر یہ احساس پیدا فرمادے تو مسائل درست ہو جائیں۔

دفتر کا سامان امانت ہے

جس دفتر میں آپ کام کر رہے ہیں۔ اس دفتر کا جتنا سامان ہے۔ وہ سب آپ کے پاس امانت ہے اس لئے کہ وہ سامان آپ کو اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو دفتری کاموں میں استعمال کریں لہذا آپ اس کو ذاتی کاموں میں استعمال نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دفتر کی معمولی چیز اپنے ذاتی کام میں استعمال کرلی اس میں کیا حرج ہے؟ یاد رکھو خیانت چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی ہو، دونوں حرام ہیں، اور گناہ کبیرہ ہیں۔ دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ اس لئے ان دونوں سے بچنا ضروری ہے۔

سرکاری اشیاء امانت ہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ "امانت" کے صحیح معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے آپ پر بھروسہ کر کے اپنا کوئی کام آپ کے سپرد کیا، اور پھر آپ نے وہ کام اس کے

بھروسہ کے مطابق انجام نہ دیا تو یہ خیانت ہوگی، یہ سڑکیں جن پر آپ چلتے ہیں۔ یہ بسیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ ٹرینیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ سب امانت ہیں۔ یعنی ان کو جائز طریقے پر استعمال کیا جائے اور اگر ان کو اس جائز طریقے سے ہٹ کر استعمال کیا جارہا ہے۔ تو وہ خیانت کے اندر داخل ہے۔ مثلاً اس کو استعمال کرتے وقت گندہ اور خراب کر دیا۔ آج کل تو لوگوں نے سڑکوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ کسی نے کھود کر نالی نکال لی اور پانی جانے کا راستہ بنا دیا۔ کسی نے سڑک گھیر کر شامیانہ لگا دیا۔ حالانکہ فقہاء کرام نے یہاں تک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے گھر کا پرنالہ باہر سڑک کی طرف نکال دیا، تو اس شخص نے ایک ایسی فضا استعمال کی جو اس کی ملکیت میں نہیں تھی، اس لئے اس شخص اس کے لئے سڑک کی طرف پرنالہ نکالنا جائز نہیں، حالانکہ وہ پرنالہ کوئی جگہ نہیں گھیر رہا ہے۔ بلکہ فضا کے ایک حصے میں وہ پرنالہ نکلا ہوا ہے اس پر فقہاء کرام نے تفصیلی بحث کی ہے کہ کہاں پرنالہ نکالنا جائز ہے کتنا نکالنا جائز ہے کتنا نکالنا حرام ہے، اس لئے کہ وہ جگہ امانت ہے اپنی ملک کا حصہ نہیں ہے۔

حضرت عباسؓ کا پرنالہ

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کے پرنالے کا قصہ مشہور ہے ان کا گھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل ساتھ ملا ہوا تھا، ان کے گھر کا ایک پرنالہ مسجد نبوی کے صحن میں گرتا تھا ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس پرنالے پر نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پرنالہ مسجد میں نکلا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ پرنالہ کس کا ہے جو مسجد کے صحن کی طرف لگا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ ہے، آپ نے حکم فرمایا کہ اس کو توڑ دو۔ مسجد کی طرف کسی کو پرنالہ نکالنا جائز نہیں، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو ملاقات کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ عمر یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد نبوی میں نکلا ہوا تھا۔ اس لئے گرا دیا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

یہ پرنالہ میں نے نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ حضور کی اجازت سے لگایا تھا تو فوراً فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ مسجد نبوی میں تشریف لا کر خود جھک کر رکوع کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عباس! خدا کے لئے میری کمر پر سوار ہو کر اس پرنالے کو دوبارہ لگاؤ، اس لئے کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت دیئے ہوئے پرنالے کو توڑ دے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں لگوا لوں گا۔ آپ رہنے دیں، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، جب میں نے توڑا ہے لہٰذا اب میں ہی اس کی سزا بھگتو نگا۔ بہر حال! شریعت کا اصل مسئلہ تو یہی تھا کہ حاکم کی اجازت کے بغیر وہ پرنالہ لگانا جائز نہیں تھا۔ لیکن چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لگانے کی اجازت دیدی تھی۔ اسی لئے اس کو لگانا ان کے لئے جائز ہو گیا۔

(طبقات ابن سعد ج ۴ صفحہ ۲۰)

آج یہ حال ہے کہ جس شخص کا جتنی زمین پر قبضہ کرنے کا دل چاہا قبضہ کر لیا۔ اور اس کی کوئی فکر نہیں کہ یہ ہم گناہ کے کام کر رہے ہیں۔ نمازیں بھی ہو رہی ہیں، اور یہ خیانت بھی ہو رہی ہے۔ یہ سب کام امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

مجلس کی گفتگو امانت ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"المجالس بالامانة"

(جامع الاصول ۶: ۵۴۵)

یعنی مجلسوں میں جو بات کی گئی ہو، وہ بھی سننے والوں کی پاس امانت ہے مثلاً دو تین آدمیوں نے آپس میں مل کر باتیں کیں۔ بے تکلفی میں باہم اعتماد کی فضا میں راز کی باتیں کر

لیں۔ اب ان باتوں کو ان کی اجازت کے بغیر دوسروں تک پہنچانا بھی خیانت کے اندر داخل ہے۔ اور ناجائز ہے۔ جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ادھر کی بات ادھر لگادی۔ اور ادھر کی بات ادھر لگادی۔ یہ سارا فتنہ فساد اسی طرح پھیلتا ہے۔ البتہ اگر مجلس میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً دو تین آدمیوں نے مل کر یہ سازش کی فلاں وقت پر فلاں شخص کے گھر پر حملہ کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ بات ایسی نہیں ہے۔ جس کو چھپایا جائے، بلکہ اس شخص کو بتا دیا جائے کہ تمہارے خلاف یہ سازش ہوئی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی بات نہ ہوئی ہو وہاں کسی کے راز کی بات دوسروں تک پہنچانا ناجائز ہے۔

راز کی باتیں امانت ہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راز کی بات مجلس میں ایک شخص نے سنی، اس نے جاکر دوسرے کو یہ تاکید کر کے سنادی کہ یہ راز کی بات بتارہا ہوں۔ تمہیں تو بتادی، لیکن کسی اور سے مت کہنا، اب وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تاکید کر کے میں نے راز کا تحفظ کر لیا کہ آگے یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ اب وہ سننے والا آگے تیسرے شخص کو وہ راز کی بات اس تاکید کے ساتھ بتادیتا ہے۔ کہ یہ راز کی بات ہے۔ تم آگے کسی اور سے مت کہنا، یہ سلسلہ آگے اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے امانت کا خیال کر لیا۔ حالانکہ جب وہ بات راز تھی، اور دوسروں سے کہنے کو منع کیا گیا تھا تو پھر اس تاکید کے ساتھ کہنا بھی امانت کے خلاف ہے یہ خیانت ہے اور جائز نہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہمارے معاشرے میں فساد برپا رکھا ہے۔ آپ غور کر کے دیکھیں گے تو یہی نظر آئے گا کہ فساد اسی طرح برپا ہوتے ہیں کہ فلاں شخص تو آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، اب اس کے دل میں اس کے خلاف غصہ اور بغض اور عناد پیدا ہو گیا، اس لئے اس لگائی بجھائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

ٹیلیفون پر دوسروں کی باتیں سننا

دو آدمی آپ سے علیحدہ ہو کر آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں۔ اور آپ چھپ کر ان کی باتوں کو سننے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ میں ان کی باتیں سن لوں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ امانت میں خیانت ہے۔

یا ٹیلیفون کرتے وقت کسی کی لائن آپ کے فون سے مل گئی اب آپ نے ان کی باتوں کو سننا شروع کر دیا۔ یہ سب امانت میں خیانت ہے، تجسس میں داخل ہے، اور نا جائز ہے، حلانکہ آج اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ مجھے فلاں کا راز معلوم ہو گیا۔ اس کو بڑا ہنر اور بڑا فن سمجھا تا ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ کہ یہ خیانت کے اندر داخل ہے، اور نا جائز ہے۔

خلاصہ

غرض یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے مصداق اتنے ہیں کہ شاید زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں ہمیں امانت کا حکم نہ ہو۔ اور خیانت سے ہمیں روکا نہ گیا ہو، یہ سلری باتیں جو میں نے ذکر کیں ہیں، یہ سب امانت کے خلاف ہیں اور نفاق کے اندر داخل ہیں، لہٰذا یہ حدیث ہر وقت مستحضر رہنی چاہئے کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور اگر اس کے پاس کوئی امانت آئے تو اس میں خیانت کرے، اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ سب کی اس سے حفاظت فرمائے، یہ سب دین کا حصہ ہے، ہم لوگوں نے دین کو بہت محدود کر رکھا ہے، اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان باتوں کو فراموش کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں فکر پیدا فرمادے۔ اور اس کی توفیق عطا فرمادے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اس طریقے پر ہم عمل کریں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت : ۲۹/ نومبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ، بعد نماز عصر
مقام : جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی

"معاشرہ کس چیز کا نام ہے؟ آپ کا، میرا، اور افراد کے مجموعے کا نام معاشرہ ہے۔ اب اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں تو رفتہ رفتہ سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اگر معاملہ یہ رہا کہ میں تمہارے اوپر تنقید کروں، اور تم میرے اوپر تنقید کرو، میں تمہاری برائی بیان کروں، اور تم میری برائی بیان کرو، اس طرح کبھی بھی معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، واشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمداً عبده ورسوله۔ صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً۔

امابعد! فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم
يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم الى الله مرجعكم جميعاً فينبئكم بما كنتم تعملون ○

(سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۱۰۵)

آمنت بالله صدق الله مولانا العظيم وصدق رسوله النبى الكريم۔ ونحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العالمين۔

عجیب و غریب آیت

یہ ایک عجیب و غریب آیت ہے، جو ہماری ایک بہت بڑی بیماری کی تشخیص کر رہی ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ یہ آیت ہماری دکھتی ہوئی رگ پکڑ رہی ہے، اللہ جل شانہ سے زیادہ کون انسان کی نفسیات اور اسکے مزاج اور اس کی بیماریوں کو پہچان سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس آیت میں ہمارے ایک بہت بڑے سوال کا جواب بھی دیا گیا ہے، جو آجکل کثرت سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے۔

اصلاح معاشرہ کی کوششیں کیوں بے اثر ہیں؟

پہلے وہ سوال عرض کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس آیت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکے گا۔ بعض اوقات ہمارے اور آپ کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ اصلاح حال، اور اصلاح معاشرہ کی نہ جانے کتنی کوششیں مختلف جہتوں اور مختلف گوشوں سے ہو رہی ہیں۔ کتنی انجمنیں، کتنی جماعتیں، کتنی پارٹیاں، کتنے افراد، کتنے جلسے، کتنے جلوس، کتنے اجتماع ہوتے ہیں۔ اور سب کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سد باب کیا جائے، معاشرے کو سیدھے راستے پر لایا جائے۔ اور انسان کو انسان بنانے کی فکر کی جائے۔ ہر ایک کے اغراض و مقاصد میں اصلاح حال، اصلاح معاشرہ، فلاح و بہبود جیسی بڑی بڑی باتیں درج ہوتی ہیں اور بڑے بڑے دعوے ہوتے ہیں۔ جو انجمنیں اور جماعتیں اس کام پر لگی ہوئی ہیں اور جو ایسے افراد اس کام میں معروف ہیں۔ اگر ان کو شمار کیا جائے تو شاید ہزاروں تک ان کی تعداد پہنچے گی۔ ہزاروں جماعتیں ہزاروں افراد اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔

لیکن دوسری طرف اگر معاشرے کی عمومی حالت کو بازاروں میں نکل کر دیکھیں۔ دفتروں میں جا کر دیکھیں۔ جیتی جاگتی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری کوششیں ایک طرف اور گمراہی کا سیلاب ایک طرف، معاشرے پر اس اصلاح کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا پہیہ اسی طرح غلط راستے پر گھوم رہا ہے، اگر ترقی ہو رہی ہے تو برائی میں ہو رہی ہے۔

اچھائی میں نہیں ہو رہی ہیں۔ تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری کوششیں معاشرے کو بدلنے میں کیوں ناکام نظر آتی ہیں؟ اکا دکا مثالیں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اگر پورے معاشرے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

بیماری کی تشخیص

اس سوال کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عطا فرمایا ہے۔ اور ہماری ایک بیماری کی تشخیص بھی فرمادی ہے۔ اور یہ وہ آیت ہے جو اکثر و بیشتر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اس کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں۔ مفہوم بھی پیش نظر نہیں رہتا۔

یا ایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون۔

(سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۱۰۵)

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کی خبر لو، اگر تم سیدھے راستے پر آگئے (تم نے ہدایت حاصل کرلی۔ صحیح راستہ اختیار کرلیا) تو جو لوگ گمراہ ہیں۔ ان کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، وہاں پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتائیں گے کہ تم دنیا کے اندر کیا کرتے رہے ہو۔

اپنے حال سے غافل، اور دوسروں کی فکر

اس آیت میں ہماری ایک بہت بنیادی بیماری یہ بتادی کہ یہ اصلاح کی کوششیں جو ناکام نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جب اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کا آغاز دوسرا شخص اپنے آپ سے

کرے، یہ خود دوسروں کو بلا رہا ہے۔ دوسروں کو دعوت دے رہا ہے۔ دوسروں کو اصلاح کا پیغام دے رہا ہے۔ لیکن اپنے آپ سے اور اپنے حالات میں تبدیلی لانے سے غافل ہوتا ہے، آج ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ مختلف محفلوں اور مجلسوں میں ہمارا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ ہم معاشرے کی برائیوں کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے ہیں "سب لوگ تو یوں کر رہے ہیں۔" "لوگوں کا تو یہ حال ہے" "معاشرہ تو اس درجے خراب ہو گیا ہے" "فلاں کو میں نے دیکھا وہ یوں کر رہا تھا" سب سے آسان کام اس بگڑے ہوئے معاشرے میں یہ ہے کہ دوسروں پر انسان اعتراض کر دے، تنقید کر دے، دوسروں کے عیب بیان کر دے کہ لوگ تو یوں کر رہے ہیں، اور معاشرے کے اندر یہ ہو رہا ہے، شاید ہی ہماری کوئی محفل اور کوئی مجلس اس تذکرے سے خالی ہوتی ہو، لیکن کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ خود میں کتنا بگڑ گیا ہوں، خود میرے حالات کتنے خراب ہیں۔ خود میرا طرز عمل کتنا غلط ہے، اس کی کتنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بس دوسروں پر تنقید کا سلسلہ جاری رہتا ہے دوسروں کی عیب جوئی جاری رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری گفتگو لطف سخن کے لئے مجلس آرائی کے لئے مزہ لینے کے لئے ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھتا۔

سب سے زیادہ برباد شخص!

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا عجیب ارشاد ہے ہم لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے فرمایا کہ:

من قال هلك الناس فهو اهلكهم

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن قول، هلک الناس حدیث نمبر ۲۶۲۳)

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ و برباد ہو گئی (یعنی دوسروں پر اعتراض کر رہا ہے کہ وہ بگڑ گئے۔ انکے اندر بے دینی آگئی، ان کے اندر بے راہ روی آگئی، وہ بد عنوانیوں کا ارتکاب کرنے لگے) تو سب سے زیادہ برباد خود وہ شخص ہے۔

اس لئے کہ دوسروں پر اعتراض کی غرض سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ برباد ہو گئے اگر اس کو واقعی بربادی کی فکر ہوتی تو پہلے اپنے گریباں میں منہ ڈالتا، اپنی اصلاح کی فکر کرتا۔

بیمار شخص کو دوسرے کی بیماری کی فکر کہاں؟

جس شخص کے اپنے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، مروڑ اٹھ رہے ہوں۔ چین نہ آرہا ہو، وہ دوسروں کی چھینکوں کی کیا پرواہ کریگا کہ دوسرے کو چھینکیں آرہی ہیں، نزلہ ہو رہا ہے۔ خدانہ کرے، اگر میرے پیٹ میں شدید درد ہے، تو مجھے اپنی فکر ہوگی، اپنی جان کی فکر ہوگی، اپنے درد کو دور کرنے کی فکر ہوگی، اپنی تکلیف مٹانے کی فکر ہوگی، دوسرے کی بیماری اور دوسرے کی معمولی تکلیف کی طرف دھیان بھی نہیں جائیگا، بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر اپنی تکلیف معمولی ہے، اور دوسرے کی تکلیف بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود اپنی تکلیف کا خیال اتنا چھایا ہوا ہوتا ہے کہ دوسرے کی بڑھی ہوئی تکلیف بھی نظر نہیں آتی۔

"لیکن اس کے پیٹ میں تو درد نہیں"

میری ایک عزیز خاتون تھی۔ ان کے پیٹ میں تکلیف تھی، اور وہ تکلیف ایسی تشویش ناک نہیں تھی۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس دکھانے کے لئے کسی ہسپتال میں لے گیا، تو لفٹ (Lift) میں جاتے ہوئے دیکھا کہ ایک خاتون رواں کرسی (Wheel Chair) پر سوار آئیں۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں سب ٹوٹے ہوئے تھے، اور اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، اور سینہ جلا ہوا تھا۔ اور اس کی بری حالت تھی، میں نے اپنی عزیز خاتون کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ دیکھئے کہ یہ عورت کتنی سخت پریشانی اور کتنی سخت تکلیف میں ہے، اس کو دیکھنے سے آدمی کو اپنی تکلیف کی کمی کا احساس ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر زبان پر جاری ہوتا ہے، تو جواب میں وہ خاتون کہتی ہیں کہ واقعی اس کے ہاتھ پاؤں تو ٹوٹ گئے ہیں، مگر کم از کم اس کے پیٹ میں تو درد نہیں ہو رہا ہے۔ تو ان کے ذہن میں سب سے بڑی تکلیف یہ

تھی کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اس کی جلی ہوئی کھال، اور ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ کر بھی ان کو اپنی تکلیف کا خیل نہیں جارہا تھا۔ اس لئے کہ اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس ہے۔ لیکن جس شخص کو اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس نہیں ہوتا دوسرے کی معمولی معمولی تکلیفوں کو دیکھتا پھرتا ہے تو ہماری ایک بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی فکر سے غافل ہیں۔ اور دوسروں پر اعتراض اور تنقید کرنے کے لئے ہم لوگ ہر وقت تیار ہیں۔

بیماری کا علاج

اللہ جل جلالہ اس آیت کے اندر فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! پہلے اپنے آپ کی فکر کرو، اور یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص گمراہ ہو گیا، فلاں شخص تباہ و برباد ہو گیا۔ تو یاد رکھو کہ اگر تم سیدھے راستے پر آگئے تو اس کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ ہر انسان کے ساتھ اس کا اپنا عمل جائیگا، لہٰذا اپنی فکر کرو، تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔ وہاں وہ تمہیں بتائیگا کہ تم کیا عمل کرتے رہے تھے، تمہارا عمل زیادہ بہتر تھا، یا دوسرے کا عمل زیادہ بہتر تھا۔ کیا معلوم کہ جس پر اعتراض کر رہے ہو۔ جس کے عیب تلاش کر رہے ہو، اس کی کوئی ادا، اس کا کوئی فعل اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں اتنا مقبول ہو کہ وہ تم سے آگے نکل جائے، بہر حال! یہ صرف لطف سخن کے لئے اور مجلس آرائی کے لئے ہم لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ اصلاح کا راستہ نہیں۔

خود احتسابی کی مجلس

ہاں! اگر کسی جگہ محفل ہی اسی کام کے لئے منعقد ہو کہ اس میں اس بات کا تذکرہ ہو کہ ہم لوگوں میں کیا کیا خرابیاں پائی جاتی ہیں، اور لوگ اس نیت سے اس محفل میں شریک ہوں کہ ان باتوں کو سنیں گے، اور سمجھیں گے، اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرینگے، تو پھر ایسی محفل منعقد کرنا درست ہے۔

انسان کا سب سے پہلا کام

انسان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے شب و روز کا جائزہ لے اور پھر یہ دیکھے کہ میں کتنا کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کر رہا ہوں۔ اور کتنا کام اس کے خلاف کر رہا ہوں، اگر اس کے خلاف کر رہا ہوں تو اس کی اصلاح کا کیا راستہ ہے؟ اللہ تعالیٰ یہ فکر ہمارے اور آپ کے دلوں میں پیدا فرما دے تو ہمارے معاشرے کی اصلاح بھی ہو جائیگی۔

معاشرہ کیا ہے؟

معاشرہ کس چیز کا نام ہے؟ انہیں افراد کا مجموعہ معاشرہ بن جاتا ہے، اگر ہر شخص کو اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے تو سارا معاشرہ خود بخود سدھر جائے۔ لیکن اگر ہر شخص دوسرے کی فکر کرتا رہے، اور اپنے کو چھوڑتا رہے تو سارا معاشرہ خراب ہی رہیگا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات کو دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا ہر شخص اس فکر میں تھا کہ کسی طرح میں درست ہو جاؤں، کسی طرح میں اپنی بیماریوں کو دور کر لوں، چنانچہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جو مشہور صحابی ہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے، اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہو کر اور آپ کی باتیں سن کر دلوں پر کیا اثر ہوتا ہو گا۔ کیسی رقت طاری ہوتی ہوگی، کیسا جذبہ پیدا ہوتا ہو گا ایک دن مضطربانہ چیختے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! "نافق حنظلة" حنظلہ تو منافق ہو گیا، یعنی اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ میں منافق ہو گیا، آپ نے ان سے پوچھا کہ کیسے منافق ہو گئے؟ کہا: یا رسول اللہ! جب تک آپ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں آپ کی بات سنتا ہوں تو دل پر بڑا اثر ہوتا ہے، حالات بہتر کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے، لیکن جب باہر نکلتا ہوں، اور دنیا کے کاموں کے اندر لگتا ہوں تو وہ جذبہ جو آپ کی مجلس میں بیٹھ کر پیدا

ہوا تھا، وہ ختم ہو جاتا ہے، یہ تو منافق کا کام ہے۔ کہ ظاہر حالات کچھ ہوں اور اندر کچھ ہوں، اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا۔

سرکار دو عالم صلی الہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ حنظلہ! تم منافق نہیں ہوئے، بلکہ "ساعۃً فساعۃً" یہ گھڑی گھڑی کی بات ہوتی ہے۔ ہر وقت دل کی کیفیت ایک جیسی نہیں رہتی، کسی وقت جذبہ زیادہ ہوتا ہے کسی وقت کم ہوتا ہے، اس سے یہ سمجھنا کہ میں منافق ہو گیا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فضل دوام الذکر والفکر فی امور الاخرۃ، حدیث نمبر ۲۷۵۰)

حضرت حنظلہ کے دل میں اپنے بارے تو یہ خیال پیدا ہوا کہ میں منافق ہو گیا لیکن آپ نے کسی دوسرے کو منافق نہیں کہا، خود احتسابی سے اپنے آپ کو منافق تصور کر کے بے قرار ہو گئے کہ اپنی فکر ہے، یہ فکر ہے کہ کہیں میرے اندر تو نفاق نہیں آگیا ہے۔؟

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے راز بتلا رکھے تھے، آپ ہی کو رازداری سے منافقین کی پوری فہرست بھی بتا رکھی تھی کہ مدینہ شریف میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ اور اس درجہ وثوق سے بتا رکھی تھی کہ جب مدینہ طیبہ میں کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ دیکھتے تھے کہ اس نماز جنازہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص مومن تھا۔ اور اگر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے جنازہ میں شامل نہیں تو صحابہ کرام یہ اندازہ کیا کرتے تھے کہ شاید یہ شخص منافق ہے، اگر مومن ہوتا تو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضرور شامل ہوتے۔

خلیفہ ثانی کو اپنے نفاق کا اندیشہ

کتب حدیث میں آتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جب کہ خلیفہ بن چکے ہیں۔ اور آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت ہے اور جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب دیکھو غلط کار لوگوں کی اصلاح کے لئے درہ لئے پھر رہے ہیں، انتظام کا رعب اور دبدبہ ہے، لیکن اسی عالم میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے خوشامد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لئے مجھے یہ بتادو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں منافقین کی جو فہرست بتادی ہے۔ اس میں عمر بن خطاب کا نام تو نہیں ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں میرا نام تو اس فہرست میں شامل نہیں؟ کہیں میں منافقین میں شامل تو نہیں؟

(البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص ۱۹)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہ حال تھا کہ ہر ایک کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ میرا کوئی فعل، میرا کوئی عمل، میرا کوئی قول، میری کوئی ادا اللہ تبارک وتعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف تو نہیں ہے، اور جب یہ فکر لگی ہوئی ہے تو اب جب وہ کسی دوسرے سے کوئی اصلاح کی بات کہتے ہیں تو وہ بات دل پر اثر انداز ہوتی ہے، اس سے زندگیاں بدلتی ہیں، اس سے انقلاب آتے ہیں، اور انقلاب برپا کر کے دنیا کو دکھا بھی دیا علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے مشہور واعظ تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے ایک ایک وعظ میں نو نو سو آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر گناہوں سے توبہ کی ہے۔ بس ایک وعظ کہہ دیا۔ اور سب کا دل کھینچ لیا۔۔۔ اور بات یہ نہیں تھی کہ ان کی تقریر بہت جوشیلی ہوتی تھی۔ یا بڑی فصیح بلیغ ہوتی تھی۔ بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ دل سے اٹھتا ہوا جذبہ جب زبان سے باہر نکلتا ہے تو وہ دوسرے کے دل پر اثر ڈالتا ہے۔

ہمارا حال

ہماری یہ حالت ہے کہ میں آپ کو ایک بات کی نصیحت کر رہا ہوں، اور خود میرا عمل اس پر نہیں ہے۔ اس لئے اولاً تو اس بات کا اثر نہ ہوگا، اور اگر اس بات کا اثر ہو بھی گیا تو سننے والا جب یہ دیکھے گا کہ یہ خود تو اس کام کو نہیں کر رہے ہیں۔ اور ہمیں نصیحت کر رہے ہیں۔ اگر یہ کوئی اچھا کام ہوتا تو پہلے یہ خود عمل کرتے۔ اس طرح وہ بات ہوا میں اڑ جاتی ہے، اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نے جو انقلاب برپا کیا۔ اور صرف ۲۳ سال کی مدت میں پورے جزیرہ عرب کی کایاپلٹ دی، بلکہ پوری دنیا کی کایاپلٹ دی، یہ انقلاب اس لئے آیا کہ آپ نے جس بات کا امت کو کرنے کا حکم دیا، پہلے خود اس بات پر اس سے زیادہ عمل کیا، مثلاً ہمیں اور آپ کو حکم دیا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو۔ لیکن خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یعنی پانچ نمازوں کے علاوہ اشراق۔ چاشت اور تہجد بھی پڑھا کرتے تھے، بلکہ آپ کی یہ حالت تھی کہ:

اذاحزبه امرصلى

(مشکوۃ، کتاب الصلاۃ، باب التطوع، حدیث نمبر ۱۳۲۵)

یعنی جب آپ کو کسی کام کی پریشانی پیش آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے دعا کرتے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

جعلت قرة عيني في الصلاة۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

(نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب نمبر ایک)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ

اسی طرح دوسروں کو پورے سال میں ایک ماہ یعنی رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن آپ کا خود کا معمول یہ تھا کہ پورے سال میں کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا تھا، جس میں کم از کم تین روزے آپ نہ رکھتے ہوں، اور بعض اوقات تین سے زیادہ بھی رکھتے تھے ــ اور دوسروں کو تو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جب افطار کا وقت آجائے تو فوراً افطار کر لو۔ اور دو روزوں کو ایک ساتھ جمع کرنے کو ناجائز قرار دیا۔

"صوم وصال" کی ممانعت

چنانچہ بعض صحابہ کرام کو آپ نے دیکھا کہ وہ اس طرح دو روزے ملا کر رکھ رہے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمادیا کہ تمہارے لئے اس طرح ملا کر روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ حرام ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود "صوم وصال" رکھتے، اور یہ فرماتے کہ تم اپنے آپ کو مجھ پر قیاس نہ کرو، اس لئے کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا بھی ہے۔ اور پلاتا بھی ہے۔ یعنی تمہارے اندر اس روزے کی طاقت نہیں ہے، میرے اندر طاقت ہے۔ اس لئے میں رکھتا ہوں ــ گویا کہ دوسروں کے لئے آسانی اور سہولت کا راستہ بتا دیا کہ افطار کے وقت خوب کھاؤ، پیو، اور رات بھر کھانے کی اجازت ہے۔

(ترمذی، کتاب الصوم، باب نمبر ۶۲ حدیث نمبر ۷۷۸)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور زکوٰۃ

ہمیں اور آپ کو تو یہ حکم دیا کہ اپنے مال کا چالیسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ زکوٰۃ ادا ہو جائیگی، لیکن آپ کا یہ حال تھا کہ جتنا مال آرہا ہے، سب صدقہ ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے لئے مصلی پر تشریف لائے، اور اقامت ہو گئی، اور نماز شروع ہونے والی ہے، اچانک آپ مصلے سے ہٹ گئے اور فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس تشریف لے

آئے۔ اور نماز پڑھا دی۔ صحابہ کرام کو اس پر تعجب ہوا چنانچہ نماز کے بعد صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آج آپ نے ایسا عمل کیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اس کی کیا وجہ تھی؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ میں اس لئے گھر واپس گیا تھا کہ جب میں مصلی پر کھڑا ہوا، اس وقت مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں سات دینار (اشرفیاں) پڑے ہیں۔ اور مجھے اس بات سے شرم آئی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حالت میں پیش ہو کہ اس کے گھر میں ضرورت سے زائد سات دینار رکھے ہوں، چنانچہ میں نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ اور پھر اس کے بعد آکر نماز پڑھائی۔

اللہ کے محبوب نے خندق بھی کھودی

غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودی جارہی ہے، صحابہ کرام خندق کھودنے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ دوسرے لوگ تو خندق کھودیں، اور خود امیر ہونے کی وجہ سے آرام سے بستر پر سو جائیں، بلکہ وہاں یہ حال تھا کہ دوسروں کو جتنا حصہ کھودنے کے لئے ملا تھا، اتنا حصہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لئے بھی مقرر فرمایا، ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں جب خندق کھودی جارہی تھی، مشقت کا وقت تھا، اور کھانے پینے کا کماحقہ انتظام نہیں تھا، اور میں بھوک سے بیتاب ہو رہا تھا، تو بھوک کی شدت کی وجہ سے میں نے اپنے پیٹ پر ایک پتھر باندھ لیا تھا۔

پیٹ پر پتھر باندھنا

پیٹ پر پتھر باندھنے کا محاورہ ہم نے اور آپ نے بہت سنا ہے، لیکن کبھی دیکھا نہیں ــ اور اللہ تعالیٰ نہ دکھائے آمین ــ لیکن جس پر یہ حالت گزری ہو وہ جانتا ہے ــ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ پر پتھر باندھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور پتھر باندھنے سے کسی طرح بھوک مٹتی ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جب بھوک کی شدت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے انسان کو اتنی کمزوری لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ کام نہیں کر سکتا، اور پتھر باندھنے سے پیٹ پر ذرا ثقل ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے آدمی میں کھڑا ہونے کی طاقت آجاتی

ہے۔ ورنہ وہ کمزوری کی وجہ سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔

تاجدار مدینہ کے پیٹ پر دو پتھر تھے

بہر حال! تو ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ شدت بھوک کی وجہ سے میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا تھا، اور اسی حالت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ پر سے قمیص اٹھا دی، اور میں نے دیکھا کہ آپ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ چیز کہ جس بات کی تعلیم دی جارہی ہے، جس بات کی تبلیغ کی جارہی ہے، جس بات کا حکم دیا جارہا ہے، پہلے خود اس پر اس سے زیادہ عمل کر کے دکھا دیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مشقت اٹھانا

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جنت کی خواتین کی سردار، ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں، اور اپنے ہاتھ مبارک دکھا کر عرض کرتی ہیں کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیس پیس کر گٹے پڑ گئے ہیں، اور پانی کی مشک ڈھو ڈھو کر سینے پر نیل آگئے ہیں یا رسول اللہ! خیبر کی فتح کے بعد سارے مسلمانوں کے درمیان غلام اور کنیزیں تقسیم ہوئی ہیں، جو ان کے گھروں کا کام کرتی ہیں، لہٰذا کوئی خدمت گار کنیز مجھے بھی عطا فرما دیجئے۔

اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی کنیز خدمت کے لئے مل جاتی تو اس کی وجہ سے آسمان نہ ٹوٹتا، لیکن جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

فاطمہ! جب تک سارے مسلمانوں کا انتظام نہیں ہو جاتا، اس

وقت تک محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے گھر والوں کے لئے کوئی غلام اور کنیز نہیں آئیگی میں تمہیں اس مشقت کے عوض غلام اور کنیز سے بہتر نسخہ بتاتا ہوں، اور پھر فرمایا کہ ہر نماز کے بعد "سبحان اللہ" ۳۳ بار "الحمد للہ" ۳۳ بار، اور "اللہ اکبر" ۳۴ بار پڑھا کرو

(صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۳۵۱)

اس وجہ سے اس کو "تسبیح فاطمہ" کہا جاتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کی تلقین فرمائی تھی ۔۔ لہٰذا دوسروں کے ساتھ تو معاملہ یہ ہے کہ غلام تقسیم ہو رہے ہیں۔ کنیزیں تقسیم ہو رہی ہیں، اور پیسے بھی تقسیم ہو رہے ہیں، اور خود اپنے گھر میں یہ حالت ہے۔

لہٰذا جب یہ صورت ہوتی ہے کہ خود کہنے والا دوسروں سے زیادہ عمل کرتا ہے تو اس کی بات میں تاثیر ہوتی ہے، اور وہ بات پھر دل پر اثر انداز ہوتی ہے وہ انسانوں کی دنیا بدل دیتی ہے، ان کی زندگیوں میں انقلابات لاتی ہے۔ اور انقلاب لائی، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں نے صحابہ کرام کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

۳۰ شعبان کو نفلی روزہ رکھنا

تیس شعبان کا جو دن ہوتا ہے، اس میں حکم یہ ہے کہ اس دن روزہ نہ رکھا جائے، بعض لوگ اس خیال سے روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید آج رمضان کا دن ہو۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ رمضان کا چاند ہو چکا ہو، لیکن ہمیں نظر نہ آیا ہو، اس لئے احتیاط کے طور پر لوگ شعبان کی ۳۰ تاریخ کا روزہ رکھ لیتے ہیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاط رمضان کے طور پر تیس شعبان کو روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے ۔۔ لیکن یہ روزہ نہ رکھنے کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو صرف احتیاط رمضان کی غرض سے روزہ رکھ رہا ہو، البتہ جو شخص عام نفلی روزے رکھتا چلا آرہا ہے، اور وہ اگر

۳۰ شعبان کو بھی روزہ رکھ لے، اور احتیاط رمضان کی نیت اور خیال دل میں نہ ہو تو اس کے لئے جائز ہے۔

(ترمذی، کتاب الصوم، باب نمبر ۳)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ۳۰ شعبان کے دن خود روزے سے ہوتے تھے۔ اور پورے شہر میں منادی کرتے ہوئے پھرتے تھے کہ آج کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے، اس لئے کہ عام لوگوں کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ اس دن روزہ رکھیں گے تو احتیاط رمضان کا خیال ان کے دل میں آجائے گا اور روزہ رکھنا گناہ ہو گا، اس لئے سختی سے منع فرمایا دیا۔

حضرت تھانوی ؒ کی احتیاط

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ، جن کے ہم اور آپ نام لیوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ــــ آپ کو لوگوں کے لئے فتویٰ کے اندر آسانی پیدا کرنے کی ہر وقت فکر رہتی تھی، تاکہ لوگوں کو مشکلات نہ ہو، جتنا ہو سکے آسانی پیدا کی جائے ــــ آج کل بازاروں میں پھلوں کی جو خرید و فروخت ہوتی ہے آپ حضرات جانتے ہونگے کہ آج کل یہ ہوتا ہے کہ ابھی درخت پر پھول بھی نہیں آتا کہ پوری فصل فروخت کر دی جاتی ہے اور اس طرح پھل کے آئے بغیر اس کو بیچنا شرعاً جائز نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرماتے تھے کہ جب تک پھل ظاہر نہ ہو جائے اس وقت بیچنا جائز نہیں ــــ اس شرعی حکم کی وجہ سے بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بازاروں میں جو پھل فروخت ہوتے ہیں، ان کی خرید و فروخت چونکہ اسی طریقے پر ہوتی ہے، اس لئے ان پھلوں کو خرید کر کھانا جائز نہیں لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان پھلوں کو کھانے کی گنجائش ہے، البتہ خود ہمیشہ احتیاط کی اور ساری عمر بازار سے پھل لے کر نہیں کھایا، اور دوسروں کو کھانے کی اجازت دے دی۔ یہ اللہ کے بندے ہیں۔ جس چیز کی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں، اس سے زیادہ خود اس پر عمل کرتے ہیں، تب ان کی بات

میں اثر پیدا ہوتا ہے۔

معاشرے کی اصلاح کا راستہ

لہٰذا ہمارے اندر خرابی یہ ہے کہ اصلاح کا جو پروگرام شروع ہوگا۔ جو جماعت قائم ہوگی، جو انجمن کھڑی ہوگی، جو آدمی کھڑا ہوگا، اس کے دماغ میں یہ بات ہوگی کہ یہ سب لوگ خراب ہیں، ان کی اصلاح کرنی ہے۔ اور اپنی خرابی کی طرف دھیان اور فکر نہیں ــ اس لئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ:

یاایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضر کم من ضل اذا اھتدا یتم

(سورۃ المائدہ: ۱۰۵)

اے ایمان والو! اپنی خبر لو، اگر تم راستے پر آجاؤ تو گمراہ ہونے والے اور غلط راستے پر جانے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیںگے، لہٰذا مجلس آرائی کے طور پر، اور محض بر سبیل تذکرہ دوسروں کی برائیاں بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، اپنی فکر کرو، اور اپنی جتنی اصلاح کر سکتے ہو، وہ کرلو ــ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا راستہ بھی یہی ہے، اس لئے معاشرہ کس کا نام ہے؟ میرا، آپ کا اور افراد کے مجموعے کا نام معاشرہ ہے، اب اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرلے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں، تو رفتہ رفتہ سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اگر معاملہ یہ رہا کہ میں تمہارے اوپر تنقید کروں اور تم میرے اوپر تنقید کرو، میں تمہاری برائی بیان کروں، اور تم میری برائی بیان کرو، پھر تو اس طرح معاشرے کی حالت کبھی درست نہیں ہو سکتی، بلکہ اپنی فکر کرو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا جھوٹ بول رہی ہے، لیکن تم نہ بولو، دوسرے لوگ رشوت لے رہے ہیں، تم رشوت نہ لو، دوسرے لوگ سود کھارہے ہیں، تم سود نہ کھاؤ، دوسرے لوگ دھوکہ دے رہے ہیں، تم دھوکہ نہ دو، دوسرے لوگ حرام کھا رہے ہیں، تم نہ کھاؤ، لیکن اس کے تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ مجلس کے اندر تو کہہ دیں کہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اور پھر خود بھی صبح سے شام تک جھوٹ بول رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس فکر کو ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کی فکر ہو جائے۔

اپنا فرض بھی ادا کرو

البتہ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس جگہ نیکی کی بات پہنچانا ضروری ہے وہاں نیکی کی بات پہنچائے اور اپنا فرض ادا کرے، اس کے بغیر وہ ہدایت یافتہ نہیں کہلا سکتا، نہ اس کے بغیر اپنی اصلاح کا فریضہ مکمل ہوتا ہے یہی بات سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں واضح فرمادی ہے حدیث یہ ہے

عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: یاایھاالناس انکم تقرئون ھذہ الآیۃ "یاایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم" (سورۃ المائدہ: ۱۰۵) وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ۔

آیت سے غلط فہمی

یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جس میں آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کی صحیح تشریح نہ سمجھنے پر لوگوں کو تنبیہ فرمائی اور اس آیت کی تشریح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ارشاد فرمائی جس سے اس آیت کے صحیح مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ بعض لوگ اس آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اپنی خبر لو اپنی اصلاح کی فکر کرو بس اب ہمارے ذمے تو اپنی اصلاح کی فکر واجب ہے۔ اگر کسی دوسرے کو غلط کام کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو اس کو ٹوکنا، اس کی اصلاح کی فکر کرنا ہمارے ذمے ضروری نہیں ــ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ اس آیت کا یہ مطلب لینا غلط فہمی ہے۔ اس لئے کہ اگر لوگ یہ دیکھیں کہ ایک ظالم کسی دوسرے پر ظلم کر رہا ہے، لیکن وہ لوگ اس ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ظلم سے نہ روکیں تو ان حالات میں قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام افراد پر اپنا عذاب نازل فرمادیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ تمہارے سامنے ظالم ظلم کر رہا ہے اور مظلوم پٹ رہا ہے، اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی طاقت تمہارے اندر موجود ہے، لیکن اس کے باوجود تم نے یہ سوچا کہ اگر یہ ظلم کر رہا ہے یا غلط کام کر رہا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی عمل ہے۔ میں تو ظلم نہیں کر رہا ہوں۔ لہٰذا مجھے اس کے اس فعل میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور مجھے ان سے الگ رہنا چاہئے، اور وہ اپنے اس طرز عمل پر اس آیت سے استدلال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرما دیا کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر دوسرا شخص غلط کام کر رہا ہے تو اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گی ۔۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اس آیت سے یہ مطلب نکالنا بالکل غلط ہے ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم سے روکنے کی قدرت اور طاقت تمہارے اندر ہو تو تم ضرور اس کو ظلم سے روک دو۔

آیت کی صحیح تشریح و تفسیر

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں یہ جو فرمایا کہ "کسی کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، بشرطیکہ تم اپنی اصلاح کی فکر کرلو" اس میں اصل بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنی استطاعت کے مطابق اور اپنی طاقت کے مطابق امر بالمعروف کا فریضہ ادا کر چکا ہے، لیکن اس کے باوجود دوسرا شخص اس کی بات نہیں مانتا، تو تمہارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، اب تم اپنی فکر کرو، اور اپنے حالات کو درست رکھو، انشاء اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

اولاد کی اصلاح کب تک

مثلاً اولاد ہے۔ اولاد کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر والدین یہ دیکھ رہے ہیں کہ اولاد غلط راستے پر جارہی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکیں، اور اسکو غلط

کاری سے بچائیں جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ، اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ، والدین کے ذمہ یہ فرض ہے، لیکن ایک شخص نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں، لیکن اولاد نے بات نہ مانی، تو اس صورت میں انشاء اللہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہوگا، حضرت نوح علیہ اسلام کا بیٹا بھی آخر وقت تک اسلام نہیں لایا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو سمجھایا، اس کو تبلیغ کی، دعوت دی، اور ان سے زیادہ کون حق تبلیغ ادا کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک وہ اسلام نہ لایا۔ اب اس کا مواخذہ حضرت نوح علیہ السلام سے نہیں ہوگا۔

ایک شخص کا دوست غلط راستے پر جارہا ہے، غلط کاموں میں مبتلا ہے۔ اور یہ شخص اپنی استطاعت کے مطابق اپنے دوست کو پیار و محبت سے ہر طرح اس کو سمجھاتا رہا، اور سمجھا سمجھا کر تھک گیا، لیکن وہ دوست غلط کاموں سے باز نہیں آیا، تو اب اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی

تم اپنے آپ کو مت بھولو

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آیت نقل کی ہے کہ:

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون۔

(سورۃ البقرہ: ۴۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم دوسرں کو نیکی کی نصیحت کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حلانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، یعنی تم تورات کے عالم ہو، جس کی وجہ سے لوگ تمہاری طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ حکم اگرچہ یہودیوں کے لئے تھا، لیکن مسلمانوں کے لئے بطریق اولیٰ ہوگا کہ جو شخص دوسروں کو نصیحت کر رہا ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اس نصیحت کو پہلے اپنے اوپر لاگو کرے۔

یہ مسئلہ تو میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ تبلیغ کے بارے یہ حکم یہ نہیں کہ جو شخص برائی میں مبتلا ہے وہ تبلیغ نہ کرے، اور دوسروں کو نصیحت نہ کرے، بلکہ حکم یہ ہے کہ نصیحت کرے، لیکن نصیحت کرنے کے بعد یہ سوچے کہ میں جب دوسرں کو نصیحت کر رہا ہوں تو خود بھی اس پر عمل کروں، اواپنے آپ کو نہ بھولے، اور یہ نہ سمجھے کہ یہ نصیحت دوسروں کے لئے ہے، بلکہ یہ سوچے کہ یہ نصیحت میرے لئے بھی ہے۔ اور مجھے بھی اس پر عمل کرنا ہے۔

مقررین اور واعظین کے لئے خطرناک بات

اس آیت کے بعد علام نووی رحمۃ اللہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جس میں بڑی خطرناک بات ارشاد فرمائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کا مصداق بننے سے ہم سب کو بچائے۔ آمین۔ فرمایا کہ:

عن اسامة بن زيد بن حارثه رضى الله عنهما قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: يوتى بالرجل يوم القيامة فيلقى فى النار فتنبد لق اقتاب بطنه فيدور كما يدور الحمار فى الرحاء فيجتمع اليه اهل النار فيقولون يا فلان مالك؟ الم تكن تامر بالمعروف وتنهى عن المنكر؟ فيقول: بلى كنت آمر بالمعروف ولاآتيه وانهى عن المنكر وآتيه۔

(البدایۃ، جلد اول ص ۱۸۷)

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا، آگ میں گرتے ہی گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کی آنتیں پیٹ سے باہر نکل آئیں گی، اوروہ شخص اپنی آنتوں کے گرد اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے اس زمانے میں ایک بڑی

چکی ہوا کرتی تھی اس چکی میں گدھے کو باندھ دیتے تھے، وہ اس چکی کو گھماتا تھا۔ جب اہل جہنم اس کا یہ منظر دیکھیں گے تو وہ آکر اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، اور اس سے پوچھیں گے کہ یہ قصہ ہے؟ ایسی سزا تمہیں کیوں دی جارہی ہے؟ کیا تم وہ شخص نہیں ہو کہ تم لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے؟ اور برائی سے روکا کرتے تھے؟ تم عالم فاضل تھے اور داعی حق تھے اور لوگوں کے لئے مصلح کا درجہ رکھتے تھے۔ آج تمہارا یہ انجام کیسے ہوا؟ اس وقت وہ شخص جواب میں کہے گا کہ ہاں! میں اصل میں لوگوں کو تو نیکی کی نصیحت کرتا تھا۔ لیکن خود نیکی نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو برائی سے روکتا تھا، اور میں خود اس برائی کا ارتکاب کیا کرتا تھا، اس وجہ سے آج میرا یہ انجام ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ بچائے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین اس حدیث کو جب پڑھتا ہوں تو ڈر لگتا ہے وہ لوگ جن کو نیکی کی بات کہنے اور دین کی بات سنانے کا کام کرنا ہوتا ہے ان کے لئے یہ بڑا نازک اور خطرناک مرحلہ ہے، ایسا نہ ہو کر وہ اس کا مصداق بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا مصداق بننے سے بچائے، آمین۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

بہرحال! اگر آدمی کو اپنی فکر نہ ہو، اور دوسرے کی اصلاح کی فکر لے کر آدمی چل کھڑا ہو، او دوسروں کے عیب تلاش کرتا رہے تو اس طرح معاشرے کی اصلاح ہونے کے بجائے اور زیادہ فساد کا راستہ کھلتا ہے۔ اور زیادہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے سامنے ہے اگر اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ فکر پیدا فرما دے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے عیوب کا جائزہ لے کہ میں کیا کیا کام غلط کر رہا ہوں، اور پھر اس کی اصلاح کی فکر میں لگ جائے۔ چاہے دس سال کی زندگی باقی ہو، یا پندرہ سال اور بیس سال کی زندگی باقی ہو، آخر میں ہر ایک کو اپنی قبر میں پہنچنا ہے اور اپنے سارے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہونا ہے، اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا جائزہ لے، اپنے حالات کو دیکھے۔ اور اس میں جہاں جہاں خرابیاں نظر آئیں، اس کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے، پھر چاہے کوئی انجمن اور جماعت نہ بنائے لیکن ایک آدمی کم از کم اپنے

آپ کی اصلاح کر لے، اور وہ خود سیدھے راستے پر لگ جائے تو قرآن کریم کے اس حکم پر عمل ہو جائے گا ایک سے دو، دو سے تین، چراغ سے چراغ جلتا ہے شمع سے شمع روشن ہوتی ہے اور اس طرح دین کا یہ طریقہ دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ فکر پیدا فرمائیں۔ اور اپنی اصلاح کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائیں، اور اپنے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بڑوں کی اطاعت

اور

ادب کے تقاضے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب: حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم العالی
ضبط و ترتیب: محمد عبداللہ میمن
تاریخ و وقت: ۷؍ فروری ۱۹۹۲ء بروز جمعہ بعد نماز عصر
مقام: جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی

تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، اور ادب کا یہ تقاضہ ہو کہ وہ عمل نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے، اس لئے کہ ادب کے مقابلہ میں حکم کی تعمیل مقدم ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بڑوں کی اطاعت

اور

ادب کے تقاضے

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، واشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمدًا عبده ورسوله۔ صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وبارك وسلم تسليمًا كثيرًا۔ امابعد!

عن ابى العباس سهل بن سعد الساعدى رضى الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بلغه: ان بنى عمرو بن عوف كان بينهم شر فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلح بينهم فى اناس معه فجلس رسول الله صلى الله عليه وسلم وحانت الصلاة ....

(صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب من دخل لیؤم الناس، حدیث نمبر ۶۸۴)

"باب الاصلاح بین الناس" لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے بیان میں چل رہا ہے اور اس باب کی تین حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور یہ اس باب کی آخری حدیث ہے۔ جو ذرا طویل ہے اس لئے اس کا ترجمہ اور تشریح عرض کئے دیتا ہوں،

لوگوں کے درمیان صلح کرانا

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی عنہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمروابن عوف کے درمیان آپس میں جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور بعض صحابہ کرام کو بھی آپ نے ساتھ لے لیا، تا کہ اس مصالحت میں وہ مدد دیں، مصالحت کرانے کے دوران بات لمبی ہو گئی۔ اور اتنی دیر ہو گئی کہ نماز کا وقت آگیا، یعنی وہ وقت آگیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن چونکہ آپ ابھی تک فارغ نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرانے اور مصالحت کرانے کو اتنی اہمیت دی اور اس میں اتنے مصروف ہوئے کہ نماز کا مقرر وقت آگیا، اور آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

راوی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے، تو وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے، اور ان سے جا کر عرض کیا کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی ہے، اور نماز کا وقت آگیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید کچھ دیر ہو جائے، اور لوگ نماز کے انتظار میں ہیں، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ امامت کرا دیں؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہیں، ہم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہو گئی ہو گی۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ نے تکبیر کہی، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امامت کے لئے آگے بڑھ گئے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز شروع کرنے کے لئے "اللہ اکبر" کہا اور لوگوں نے تکبیر کہی، جب نماز شروع کر دی۔ تو نماز کے دوران

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اور صف میں ایک جگہ پر مقتدی کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے، جب لوگوں نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ کے آنے کے بارے میں پتہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ آگے امامت کر رہے ہیں، تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم ہو جانا چاہئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے ہیں، تاکہ وہ پیچھے ہٹ جائیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے ہو کر نماز پڑھائیں...... اور چونکہ اس وقت لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دینے کے لئے نماز کے اندر تالیاں بجانا شروع کر دیں، اور ان کو متنبہ کرنا شروع کیا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب نماز شروع کر دیتے تو ان کو دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، اور وہ کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اس لئے شروع میں جب ایک دو آدمیوں نے تالی بجائی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنی نماز میں مصروف رہے، لیکن جب صحابہ کرام نے یہ دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ التفات نہیں فرما رہے ہیں تو اس وقت لوگوں نے زیادہ زور سے تالی بجانی شروع کر دی، اور جب کئی صحابہ نے تالی بجائی اور آواز بلند ہونے لگی تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کچھ تنبہ ہوا، اور کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا تو اچانک دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صف میں تشریف فرما ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صف میں دیکھ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے منع فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو، پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، نماز پوری کر لو۔

لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو پھر ان کے بس میں نہ رہا کہ وہ اپنے مصلے پر کھڑے رہتے، اس لئے اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ صف میں آکر کھڑے ہو گئے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے مصلے پر تشریف لے گئے۔ اور پھر باقی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

امام کو متنبہ کرنے کا طریقہ

جب نماز ختم ہو گئی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور خطاب فرمایا کہ: یہ کیا طریقہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آجائے تو تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو، یہ طریقہ نماز کے شایان شان اور مناسب نہیں، اور تالیاں بجانا تو عورتوں کے لئے مشروع ہے، یعنی بالفرض اگر خواتین کی جماعت ہو رہی ہو...... ویسے خواتین کی جماعت اچھی اور پسندیدہ نہیں ہے۔ یا خواتین نماز میں شامل ہوں، اور وہ امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہیں۔ تو ان کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجائیں ان کے لئے نماز کے اندر زبان سے "سبحان اللہ" یا "الحمد للہ کہنا اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح خاتون کی آواز مردوں کے کان میں جائے گی اور خاتون کی آواز کا بھی شریعت میں پردہ ہے لہذا ان کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آئے تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کریں لیکن اگر مردوں کی جماعت میں کوئی واقعہ پیش آجائے جس کی وجہ سے امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا منظور ہو، تو اس میں مردوں کے لئے طریقہ یہ ہے کہ وہ سبحان اللہ کہیں، مثلاً امام کو بیٹھنا چاہئے تھا، اور مقتدیوں نے دیکھا کہ کھڑا ہو رہا ہے تو مقتدی کو چاہئے کہ وہ "سبحان اللہ" کہیں یا الحمد للہ کہیں یا امام کو کھڑا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ بیٹھ گیا تو اس وقت بھی سبحان اللہ کہہ دیں، یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہری نماز ہے، اور امام نے سراً قرات شروع کر دی، تو اس وقت بھی اسکو الحمد للہ وغیرہ سے متنبہ کر دے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی بھی ایسا عمل پیش آجائے، جس کی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا مقصود تو مقتدی "سبحان اللہ" کہہ دیں۔ تالیاں نہیں بجانی چاہئے۔

ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی

اس کے بعد آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ اے ابو بکر! میں نے تو آپ کو اشارہ کر دیا تھا کہ آپ اپنی نماز جاری رکھیں، اور پیچھے نہ ہٹیں، اس کے بعد پھر کیا وجہ ہوئی کہ آپ پیچھے ہٹ گئے، اور امامت کرنے

سے آپ نے تردد کیا، اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جواب دیا، فرمایا کہ:

"ما كان لابن ابي قحافة ان يصلي بالناس بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم"

یارسول اللہ! ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی موجودگی میں لوگوں کی امامت کرے۔ ابو قحافہ ان کے والد کا نام ہے، یعنی میری یہ مجال نہیں تھی کہ آپ کی موجودگی میں مصلی پر کھڑا ہو کر امامت کرتا رہوں، جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے تو بات دوسری تھی، جب آپ کو دیکھ لیا تو میرے اندر یہ تاب نہیں تھی کہ میں امامت جاری رکھوں، اس واسطے میں پیچھے ہٹ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام

اس سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اس درجہ پیوست کر رکھی تھی کہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے کھڑے ہوں اور میں آگے کھڑا رہوں۔ اگرچہ یہ واقعہ حضور کی غیر موجودگی میں پیش آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے لیکن جب پتہ لگ گیا کہ حضور پیچھے ہیں تو پھر آگے کھڑا رہنا برداشت سے باہر تھا اس لئے پیچھے ہٹ گئے۔

الامر فوق الادب

یہاں ایک مسئلہ اور ادب عرض کر دوں، جو مسنون ادب ہے، آپ نے وہ مشہور مقولہ سنا ہو گا کہ:

"الامر فوق الادب"

یعنی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، اور ادب کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ عمل نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے، یہ بڑی نازک بات ہے اور بعض اوقات اس پر عمل بھی مشکل ہوتا ہے لیکن دین پر عمل کرنے والے تمام بزرگوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے کہ جب کسی بڑے نے کسی کام کا حکم دیا تو ادب کے بجائے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔

بڑے کے حکم پر عمل کرے

مثلاً فرض کرو کہ ایک بڑا بزرگ شخص ہے اور وہ کسی امتیازی جگہ جیسے تخت وغیرہ پر بیٹھا ہے اب ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس سے چھوٹا ہے ان بزرگ نے کہا کہ: بھائی! تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ تو اس وقت اس کی بات مان لینی چاہئے اگرچہ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ پاس نہ بیٹھے، دور ہو کر بیٹھے، اس کے پاس تخت پر جا کر بیٹھ جانا ادب کے خلاف ہے۔ لیکن جب بڑے نے حکم دے کر کہہ دیا کہ یہاں آجاؤ تو اس وقت تعظیم کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کے حکم پر عمل کرے، چاہے دل میں یہ بات بری لگ رہی ہو کہ میں بڑے کے بالکل قریب جا کر بیٹھ جاؤں۔ اس لئے کہ ادب کے مقابلہ میں حکم کی تعمیل زیادہ مقدم ہے۔

دین کا خلاصہ "اتباع" ہے

میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ سارے دین کا خلاصہ ہے اتباع، بڑے کے حکم کو ماننا، اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول کے حکم کی اتباع، اور اللہ کے رسول کے وارثین کی اتباع، بس وہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو، چاہے ظاہر میں وہ بات تمہیں ادب کے خلاف معلوم ہو۔

حضرت والد صاحبؒ کی مجلس میں میری حاضری

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس اتوار کے دن ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اتوار کی سرکاری چھٹی ہوا کرتی تھی، یہ آخری مجلس کا واقعہ ہے، اس کے بعد حضرت والدؒ کی کوئی مجلس نہیں ہوئی، بلکہ اگلی مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی حضرت والدؒ کا انتقال ہو گیا چونکہ والد صاحب بیمار اور صاحب فراش تھے. اس لئے آپ کے کمرے میں ھی لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے، والد صاحب چار پائی پر ہوتے، لوگ سامنے نیچے اور صوفوں پر بیٹھ پر جایا کرتے تھے۔ اس روز لوگ بہت زیادہ آئے اور کمرہ پورا بھر گیا، حتیٰ کہ کچھ لوگ کھڑے بھی ہو گئے۔ اور مجھے حاضری میں تاخیر ہوئی۔ میں ذرا دیر سے پہنچا، حضرت والد صاحبؒ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا: تم یہاں میرے پاس آجاؤ، میں ذرا جھجکنے لگا کہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا اور چیرتا ہوا جاؤں گا اور حضرت والد صاحب کے پاس جا کر بیٹھونگا، اگرچہ یہ بات ذہن میں مستحضر تھی کہ جب بڑا کوئی بات کہے تو مان لینی چاہئے لیکن میں ذرا ہچکچا رہا تھا، حضرت والد صاحب نے جب میری ہچکچاہٹ دیکھی تو دوبارہ فرمایا: تم یہاں آجاؤ تو تمہیں ایک قصہ سناؤں۔ خیر میں کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور حضرت والد صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

حضرت تھانویؒ کی مجلس میں والد صاحب کی حاضری

والد صاحب فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس ہو رہی تھی۔ اور وہاں اسی طرح کا قصہ پیش آیا کہ جگہ تنگ ہو گئی اور بھر گئی اور میں ذرا تاخیر سے پہنچا اور تو حضرت والاؒ نے فرمایا، کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ، میں کچھ جھجکنے لگا کہ حضرتؒ کے بالکل پاس جا کر بیٹھ جاؤں تو حضرت والاؒ نے دوبارہ فرمایا کہ تم یہاں آجاؤ، پھر میں تمہیں ایک قصہ سناؤں گا۔ حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پھر میں کسی طرح پہنچ گیا۔ اور حضرت والا کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ تو حضرت والاؒ نے ایک قصہ سنایا۔

عالمگیر اور دارا شکوہ کے درمیان تخت نشینی کا فیصلہ

قصہ یہ سنایا کہ مغل بادشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد کے انتقال کے بعد باپ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یہ دو بھائی تھے۔ ایک عالمگیر اور دوسرے دارا شکوہ، آپس میں رقابت تھی۔ عالمگیر بھی اپنے باپ کے جانشیں اور بادشاہ بننا چاہتے تھے اور ان کے بھائی دارا شکوہ بھی تخت کے طالب تھے، ان کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، دونوں نے ارادہ کیا کہ ان بزرگ سے جاکر اپنے حق میں دعا کرائی جائے۔ پہلے دارا شکوہ ان بزرگ کے پاس زیارت اور دعا کے لئے پہنچے، اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے، ان بزرگ نے دارا شکوہ سے کہا کہ یہاں میرے پاس آ جاؤ، اور تخت پر بیٹھ جاؤ، دارا شکوہ نے کہا کہ نہیں حضرت، میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس تخت پر بیٹھ جاؤں، میں تو یہاں نیچے ہی ٹھیک ہوں، ان بزرگ نے پھر کہا کہ میں تمہیں بلا رہا ہوں، یہاں آ جاؤ۔ لیکن وہ نہیں مانے، اور ان کے پاس نہ گئے اور وہیں بیٹھے رہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی، پھر ان بزرگ نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرما دی اور وہ واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عالمگیرؒ آ گئے۔ وہ جب سامنے نیچے بیٹھنے لگے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آ جاؤ وہ فوراً جلدی سے اٹھے اور ان بزرگ کے پاس جاکر تخت پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرما دی جب عالمگیرؒ واپس چلے گئے تو ان بزرگ نے اپنی مجلس کے لوگوں سے فرمایا کہ ان دونوں بھائیوں نے تو خود ہی اپنا فیصلہ کر لیا۔ دارا شکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور عالمگیرؒ کو پیش کیا تو انہوں نے لے لیا، اس واسطے دونوں کا فیصلہ ہو گیا۔ اب تخت شاہی عالمگیر کو ملے گا چنانچہ ان کو ہی مل گیا۔

یہ واقعہ حضرت تھانویؒ نے حضرت والد قدس اللہ سرہ کو سنایا۔

(مواعظ حضرت تھانویؒ)

حیل و حجت نہ کرنا چاہئے

یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بہر حال! ادب یہ ہے کہ جب بڑا کہہ رہا ہے کہ یہ کام کر لو، تو اس میں زیادہ حیل و حجت کرنا ٹھیک بات نہیں، اس وقت تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جا کر بیٹھ جائے، اس لئے کہ بڑے کے حکم کی تعمیل ادب پر مقدم ہے۔

بزرگوں کے جوتے اٹھانا

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی بزرگ کے جوتے اٹھانا چاہتے ہیں اب اگر وہ بزرگ زیادہ اصرار کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ تو اس صورت میں بھی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ چھوڑ دے اور جوتے نہ اٹھائے بعض اوقات لوگ اس میں چھینا جھپٹی شروع کر دیتے ہیں اور بر سر پیکار ہو جاتے ہیں، یہ تعظیم کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

الامر فوق الادب

حکم کی تعمیل ادب کے تقاضے پر مقدم ہے بڑا جو کہے اس کو مان لو، ہاں! ایک دو مرتبہ بزرگ سے یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت! مجھے اس خدمت کا موقع دیجئے لیکن جب بڑے نے حکم ہی دے دیا تو اس صورت میں حکم کی تعمیل ہی واجب ہے۔ وہی کرنا چاہئے، عام حالات کا دستور یہی ہے جس کام کا حکم دیا جائے اس کے مطابق عمل کیا جائے، صحابہ کرام کا معمول بھی یہی ہے۔

صحابہ کرام کے دو واقعات

البتہ اس واقعہ میں جو آپ نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور ادب کے تقاضے پر عمل کیا اور حکم نہیں مانا تو اس قسم کے واقعات پورے عہد صحابہ میں صرف دو ملتے ہیں کہ جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، لیکن صحابہ نے ادب کے تقاضے کو حکم کی تعمیل پر مقدم رکھا، ایک تو

یہی واقعہ ہے اور ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔

خدا کی قسم! نہیں مٹاؤں گا

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے بلایا کو تم لکھو، انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے جب معاہدے کی شرائط لکھنی شروع کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ پر لکھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو جو شخص کفار کی طرف سے صلح کی شرائط طے کرنے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں ہم تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھنے دیں گے اور چوں کہ یہ صلح نامہ دونوں کی طرف سے ہوگا، اس لئے اس میں ایسی بات ہونی چاہئے جس پر دونوں متفق ہوں۔ ہم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے ہم تو " باسمک اللھم " لکھتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے " باسمک اللھم " یعنی "اے اللہ! آپ کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں" لکھتے تھے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اس کو مٹا دیں اور باسمک اللھم لکھیں۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمارے لئے اس میں کیا فرق پڑتا ہے، " باسمک اللھم "بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے چلو وہ مٹا دو اور یہ لکھ دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے " باسمک اللھم " لکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ لکھنا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سرداران مکہ کے درمیان طے پایا۔" کفار کی طرف سے جو نمائندہ تھا، اس نے پھر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ لفظ "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کیسے لکھ دیا؟ اگر ہم آپ کو "رسول اللہ" مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیسا، سارا جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ ہم آپ کو رسول تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا یہ معاہدہ جس پر آپ نے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" بھی لکھا ہے۔ ہم اس پر دستخط نہیں کریں گے۔ آپ صرف یہ لکھیں کہ "یہ معاہدہ جو محمد بن عبداللہ اور سرداران قریش کے درمیان طے پایا۔" تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔ "چلو، کوئی بات نہیں، تم تو مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو اس لئے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دو

اور " محمد بن عبداللہ " لکھ دو۔ " حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلی بات تو مان لی تھی اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے " باسمک اللھم " لکھ دیا تھا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "محمد رسول اللہ " کاٹ کر " محمد بن عبداللہ " لکھ دو۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بے ساختہ فرمایا کہ "واللہ لا امحوہ" خدا کی قسم میں لفظ "رسول اللہ " کو نہیں مٹاؤں گا" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مٹانے سے انکار کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے جذبات کو محسوس فرمایا اور فرمایا اچھا تم نہ مٹاؤ مجھے دو میں اپنے ہاتھ سے مٹاؤں گا چنانچہ وہ عہد نامہ آپ نے ان سے لے کر اپنے دست مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔

(صحیح مسلم، باب صلح الحدیبیة، حدیث نمبر ۶۱۳۳)

اگر حکم کی تعمیل اختیار سے باہر ہو جائے

یہاں بھی یہی واقعہ ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا تھا انہوں نے اس کی تعمیل سے انکار فرمایا اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ادب کو حکم پر مقدم کر لیا۔ حالانکہ حکم ادب پر مقدم ہے اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ اصل قاعدہ تو وہی ہے کہ بڑا جو کہہ رہا ہے اس کو مانے، اور اس کی تعمیل کرے، لیکن بعض اوقات انسان کسی حالت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے حکم کی تعمیل کرنا اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کے اندر اس کام کی استطاعت اور طاقت ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت اگر وہ اس کام سے پیچھے ہٹ جائے تو اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے نافرمانی کی بلکہ اس پر یہ حکم صادق آئے گا کہ " لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے۔ تو پہلے واقعہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو خود ہی فرما دیا کہ یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجود ہوں اور ابو قحافہ کا بیٹا امامت کر رہا ہے اور دوسرے واقعہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مغلوب الحال تھے کہ یہ بات ان کے بس سے باہر تھی کہ وہ " محمد " کے نام سے "رسول اللہ " کا لفظ مٹا دیں، اس واسطے انہوں نے مٹانے سے انکار کر دیا۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لیکن اصل حکم وہی ہے کہ محبوب جو بات کہے اس کو مانو، اپنی نہ چلاؤ، وہ جس طرح کہہ دے اسی کے مطابق عمل کرو۔

نہ ہی ہجر اچھا نہ ہی وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

؎ عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر ان کی خوشی اس میں ہے کہ میں ایسا کام کروں جو بظاہر ادب کے خلاف لگ رہا ہے تو پھر وہی کام بہتر ہے جس کے اندر ان کی خوشی ہے اور ان کی رضا ہے۔

خلاصہ

بہر حال! امام نووی ؒ جو یہاں یہ حدیث لائے ہیں، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کی اور ان کے درمیان آپس میں صلح کرانی کی اتنی اہمیت تھی کہ نماز کا جو وقت مقرر تھا، اس سے آپ کو کچھ دیر بھی ہو گئی۔ لیکن آپ اس کے اندر مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس کے جھگڑوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تجارت دین بھی دنیا بھی

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم۔
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن۔
مقام تاریخ و وقت : جناب یوسف غنی صاحب کے مکان واقع کلفٹن کراچی میں ہوا

جو تجارت ہم کر رہے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بھی بنا سکتے ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو جہنم تک پہنچنے کا راستہ بھی بنا سکتے ہیں اور فساق و فجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ان دونوں میں سے کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجارت دین بھی، دنیا بھی

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ۔

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین۔

(سورۃ التوبۃ: ۱۱۹)

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء۔

(ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجارۃ، حدیث نمبر ۱۲۰۹)

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التجار یحشرون یوم القیامۃ فجاراً الا من اتقی وبر وصدق آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین۔

مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر

بزرگان محترم و برادران عزیز! پہلے بھی ایک مرتبہ بھائی امان اللہ صاحب کی دعوت پر میری یہاں حاضری ہو چکی ہے، اور یہ ان کی اور دوستوں کی محبت کی بات ہے کہ دوبارہ ایک ایسا اجتماع انہوں نے منعقد فرمایا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ پچھلی مرتبہ جس طرح کچھ سوالات کئے گئے تھے، جن کا میری اپنی ناقص معلومات کی حد تک جو جواب بن پڑا تھا، وہ دیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ آج بھی اسی قسم کی مجلس ہوگی، کوئی تقریر یا بیان پیش نظر نہیں تھا۔ لیکن بھائی صاحب فرما رہے ہیں کہ ابتداء میں دین کی اور ایمان و یقین کی باتیں ہو جائیں۔ تو دین کی بات بیان کرنے سے تو کبھی انکار نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ دین ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اسی پتھر کو مضبوطی سے تھامنے کا توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تاجروں کا حشر انبیاء کے ساتھ

اس مجمع میں جو دوست واحباب موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق چونکہ تجارت سے ہے۔ اس لئے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ کی دو حدیثیں میرے ذہن میں آئیں۔ اور پھر قرآن کریم کی ایک آیت بھی میں نے تلاوت کی، جس سے ان دونوں حدیثوں کے مضمون کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں حدیثیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشهداء

جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ یہ تجارت جس کو ہم اور آپ دنیا کا ایک کام سمجھتے ہیں۔ اور دل میں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ تجارت ہم اپنے پیٹ کے خاطر کر رہے ہیں، اور اس کا بظاہر دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے ہیں کہ اگر تاجر میں دو باتیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ وہ صدوق ہو، اور امین ہو، صدوق

کے لفظی معنی ہیں "سچا" اور امین کے معنی ہیں "امانت دار" اگر یہ دو صفتیں اس میں پائی جائیں تو قیامت کے دن وہ انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ایک سچائی، اور ایک امانت۔

تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ

اور دوسری حدیث جو بظاہر اس کے متضاد ہے۔ وہ یہ ہے کہ:

التجار یحشرون یوم القیامۃ فجاراً الا من اتقی وبر وصدق

"تجار" قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، "فجار" فاجر کی جمع ہے، یعنی فاسق و فاجر اور گناہ گار، جو اللہ تعالیٰ کی معصیتوں کا ارتکاب کرنے والا ہے، سوائے اس شخص کے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے۔

تاجروں کی دو قسمیں

یہ دونوں حدیثیں انجام کے لحاظ سے بظاہر متضاد نظر آتی ہیں کہ پہلی حدیث میں فرمایا کہ نبیوں کے ساتھ ہونگے، صدیق اور شہداء کے ساتھ ہونگے۔ اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ فساق اور فجار کے ساتھ ہونگے، لیکن الفاظ کے ترجمہ ہی سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ تاجروں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک قسم وہ ہے جو انبیاء اور صدیقین کے ساتھ ہوگی، اور ایک قسم وہ ہے جو فاجروں اور فاسقوں کے ساتھ ہوگی۔

اور دونوں قسموں میں فرق بیان کرنے کے لئے جو شرائط بیان فرمائیں وہ یہ ہیں کہ سچائی ہو، امانت ہو، تقویٰ ہو، نیکی ہو تو پھر وہ تاجر پہلی قسم میں داخل ہے اور اس کو انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور اگر یہ شرائط اس کے اندر نہ ہوں، بلکہ صرف پیسہ حاصل کرنا مقصود ہو۔ جس طرح بھی ممکن ہو، چاہے دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر ہو، دھوکہ دے کر ہو، فریب دے کر ہو، جھوٹ بول کر ہو، دغا دے کر ہو، کسی بھی طریقے سے ہو تو پھر وہ تاجر دوسری قسم میں داخل ہے کہ اس کو فاسقوں اور فاجروں کے

ساتھ اٹھایا جائے گا۔

تجارت جنت کا سبب یا جہنم کا سبب

اگر ان دونوں حدیثوں کو ہم ملا کر دیکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو تجارت ہم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بنالیں، انبیاء علیہ السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں، اور اگر چاہیں تو اسی تجارت کو جہنم کا راستہ بنالیں اور فساق فجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس دوسرے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

ہر کام میں دو زاویئے

اور یہ بات صرف تجارت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ دنیا کے جتنے کام ہیں۔ خواہ وہ ملازمت ہو، خواہ وہ تجارت ہو، خواہ وہ زراعت ہو، یا کوئی اور دنیا کا کام ہو، ان سب میں یہی بات ہے کہ اگر اس کو انسان ایک زاویئے سے اور ایک طریقے سے دیکھے تو وہ دنیا ہے، اور اگر دوسرے زوایئے سے دیکھے تو وہی دین بھی ہے۔

زاویہ نگاہ بدل دیں

یہ دین در حقیقت صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ اگر آپ وہی کام دوسرے زاویہ سے کریں، دوسری نیت سے کریں۔ دوسرے ارادے سے کریں، دوسرے نقطہ نظر سے کریں، تو وہی چیز جو بظاہر ٹھیٹ دنیاوی چیز نظر آرہی تھی۔ دین بن جاتی ہے۔

کھانا کھانا عبادت ہے

اگر انسان کھانا کھا رہا ہے۔ تو بظاہر انسان اپنی بھوک دور کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے۔ لیکن اگر کھانا کھاتے وقت یہ نیت ہو کر میرے نفس کا مجھ پر حق ہے۔ میری

ذات کا، میرے وجود کا مجھ پر حق ہے۔ اور اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کھانا کھا رہا ہوں، اور اس لئے کھا رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا حق یہ ہے کہ میں اس کی طرف اشتیاق کا اظہار کروں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو استعمال کروں۔ تو وہی کھانا جو بظاہر لذت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور بظاہر بھوک دور کرنے کا ذریعہ تھا۔ پورا کھانا دین اور عبادت بن جائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کا تتلیاں

لوگ سمجھتے ہیں کہ دین یہ ہے کہ دنیا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ، اور اللہ اللہ کرو، بس یہی دین ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کا نام آپ نے سنا ہوگا، کون مسلمان ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں ہے۔ بڑے زبردست پیغمبر اور بڑی ابتلا اور آزمائش سے گزرے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ غسل کر رہے تھے۔ اور غسل کے دوران آسمان سے ان پر سونے کی تتلیوں کی بارش شروع ہوگئی، تو حضرت ایوب علیہ السلام غسل کو چھوڑ چھاڑ کر ان تتلیوں کو پکڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ایوب! کیا ہم نے تم کو پہلے ہی بے شمار نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں؟ تمہاری ضروریات کا سارا انتظام کر رکھا ہے۔ ساری کفالت کر رکھی ہے۔ پھر بھی تمہیں حرص ہے، اور تتلیوں کو جمع کرنے کی طرف بھاگ رہے ہو؟ تو حضرت ایوعلیہ السلام نے کیا عجیب جواب دیا کہ. اے پروردگار

"لا غنی بی عن برکتك"

جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں، جب آپ خود اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرما رہے ہیں تو اب اگر میں بیٹھا رہوں، اور یہ کہوں کہ مجھے یہ سونا چاندی نہیں چاہئے میں تو اس پر ٹھوکر مارتا ہوں تو یہ بے ادبی کی بات ہے۔ جب آپ دے رہے ہیں تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اشتیاق کے ساتھ اس کو لوں، اس کی قدر پہچانوں اور اس کا شکریہ ادا کروں۔ اس لئے میں آگے بڑھ کر ان کو جمع کر رہا ہوں۔ یہ ایک پیغمبر کی آزمائش تھی۔

ورنہ اگر کوئی عام قسم کا خشک دیندار ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو اس دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ لیکن وہ چونکہ حقیقت سے واقف تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہی چیز اگر اس نقطہ نظر سے حاصل کی جائے کہ میرے پروردگار کی دی ہوئی ہے۔ اور اس کی نعمت ہے۔ میں اس کی قدر پہچانوں۔ اس کا شکر ادا کروں، تو پھر یہ دنیا نہیں ہے۔ بلکہ یہ دین ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الغسل باب من اغتسل عریاناً وحدہ فی الخلوۃ حدیث نمبر ۲۷۹)

نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو

ہم لوگ پانچ بھائی تھے، اور سب برسرروزگار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقع پر جب ہم اکٹھے ہوتے تو حضرت والد صاحب ہمیں بعض اوقات عیدی دیا کرتے تھے، وہ عیدی کبھی ۲۰ روپے، کبھی ۲۵ روپے اور کبھی ۳۰ روپے ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب ۲۵ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں، ہم ۳۰ روپے لینگے، اور جب وہ ۳۰ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں،

، ہم ۳۵ روپے لینگے، اور تقریباً یہ صورت ہر گھر میں ہوتی ہے کہ اولاد چاہے جوان ہوگئی ہو۔ برسرروزگار ہو گئی ہو۔ کمارہی ہو لیکن اگر باپ دے رہا ہے تو اس سے مچل مچل کر مانگتے ہیں کہ اور دیدیں، اور اب وہ باپ کی طرف سے جو ۳۰ روپے دیئے گئے، اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لئے کہ ہم میں سے ہر بھائی ہزاروں روپے کمانے والا تھا۔ لیکن پھر اس ۳۰ روپے کا شوق، رغبت، اشتیاق اور اس کو حاصل کرنے کے لئے بار بار مچلنا یہ سب کیوں تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ نگاہ اس روپے پر نہیں تھی کہ ۳۰ روپے مل رہے ہیں۔ بلکہ نگاہ اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی۔ کہ وہ ۳۰ روپے کس دینے والے ہاتھ سے مل رہے ہیں۔ یہ ایک باپ کی طرف سے مل رہے ہیں۔ اور یہ ایک محبت کا اظہار ہے، یہ ایک شفقت کا اظہار ہے، یہ ایک نعمت کا اظہار ہے، لہٰذا اس کا ادب یہ ہے کہ اس کو اشتیاق کے ساتھ لیا جائے، اس کی قدر پہچانی جائے، چنانچہ اس کو خرچ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اٹھا کر لفافے میں بند کر کے

رکھ دیتے کہ یہ میرے باپ کے دیئے ہوئے ہیں۔ اگر وہی ۳۰ روپے کسی دوسرے آدمی کی طرف سے ملیں، اور انسان اس میں لالچ اور رغبت کا اظہار کرے۔ اور اس سے کہے کہ مجھے ۳۰ روپے کے بجائے ۳۵ روپے دو، تو یہ شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

اس کا نام تقویٰ ہے

دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ اور یہی زاویہ نگاہ جب بدل جاتا ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی میں دنیا کے اندر جو کچھ کر رہا ہوں، چاہے کھا رہا ہوں، چاہے سو رہا ہوں، چاہے کما رہا ہوں، اللہ کے لئے کر رہا ہوں، اللہ کے احکام کے مطابق کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی پیش نظر رکھ کر کر رہا ہوں، یہی چیز اگر حاصل ہو جائے تو اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ تقویٰ اگر پیدا ہو جائے، اور پھر اس تقویٰ کے ساتھ تجارت کریں، تو یہ تجارت دنیا نہیں، بلکہ یہ دین ہے۔ اور یہ جنت تک پہنچانے والی ہے۔ اور نبیوں کے ساتھ حشر کرانے والی ہے۔

صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے

عموماً دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح حاصل ہو؟ یہ زاویہ نگاہ کس طرح بدلا جائے؟ تو اس کے جواب کے لئے میں نے شروع میں یہ آیت تلاوت کی تھی کہ:

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا راستہ بھی بتاتا ہے کہ اور ایسا راستہ بتاتا ہے جو ہمارے اور آپ کے لئے آسان ہوتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ محض کسی کام کا حکم نہیں دیتے بلکہ ساتھ میں ہماری ضروریات، ہماری حاجتیں اور ہماری کمزوریوں کا احساس فرما کر ہمارے لئے آسان راستہ بھی بتاتے ہیں۔ تو تقویٰ حاصل

کرنے کا آسان راستہ بتا دیا کہ "کونوا مع الصادقین" سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو، یہ صحبت جب تمہیں حاصل ہوگی تو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر خود تقویٰ پیدا ہو جائے گا۔ ویسے کتاب میں تقویٰ کی شرائط پڑھ کر تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ راستہ بہت مشکل نظر آئے گا، لیکن قرآن نے اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ بتلا دیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہو دوسرے لفظوں میں جس کو صدق کی دولت حاصل ہو، اس کی صحبت اختیار کر لو۔ کیونکہ صحبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کی جاتی ہے۔ اس کا رنگ رفتہ رفتہ انسان پر چڑھ جاتا ہے۔

ہدایت کے لئے صرف کتاب کافی نہیں ہوتی

اور دین کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کا بھی یہی راستہ ہے، نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے تشریف لائے۔ ورنہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ صرف قرآن کریم نازل کر دیا جاتا، اور مشرکین مکہ کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہمارے اوپر قرآن کریم کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کتاب اس طرح نازل کر دیتے کہ جب لوگ صبح بیدار ہوتے تو ہر شخص بہت اچھا اور خوبصورت بائنڈنگ شدہ قرآن کریم اپنے سرہانے موجود پاتا۔ اور آسمان سے آواز آجاتی کہ یہ کتاب تمہارے لئے بھیج دی گئی ہے۔ اس پر عمل کرو تو یہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب رسول کے بغیر نہیں بھیجی، ہر کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا ہے، رسول تو کتاب کے بغیر آئے ہیں۔ لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں آئی، کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے، اور اس کو کسی خاص رنگ پر ڈھالنے کے لئے صرف کتاب کبھی کافی نہیں ہوتی۔

صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ

اگر کوئی شخص چاہے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں، اور

پھر اس نے وہ کتاب پڑھ لی، اور اس کو سمجھ بھی لیا، اور اس کے بعد اس نے ڈاکٹری اور علاج شروع کر دیا تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے وہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ جب تک وہ کسی ڈاکٹر کی صحبت اختیار نہ کرے، اور اس کے ساتھ کچھ مدت تک رہ کر کام نہ کرے، اس وقت تک وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا، اور میں تو آگے پڑھ کر کہتا ہوں کہ بازار میں کھانا پکانے کی کتابیں موجود ہیں، جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں۔ پلاؤ اس طرح بنتا ہے، بریانی اس طرح بنتی ہے، قورمہ ایسے بنتا ہے، اب اگر ایک شخص صرف وہ کتاب اپنے سامنے رکھ کر بریانی بنانا چاہے گا تو خدا جانے وہ کیا ملغوبہ تیار کرے گا۔ جب تک کہ کسی ملبر کے ساتھ رہ کر اس کی ٹریننگ حاصل نہ کی ہو۔ اور اس کو سمجھانہ ہو، اس وقت تک وہ بریانی تیار نہیں کر سکتا۔

متقی کی صحبت اختیار کرو

یہی معاملہ دین کا ہے کہ صرف کتاب انسان کو کسی دینی رنگ میں ڈھالنے کے لئے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی معلم اور مربی اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام کو یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ صحابہ کے کیا معنی ہیں؟ صحابہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل کیا، پھر اسی طرح تابعین نے صحابہ کی صحبت سے اور تبع تابعین نے تابعین کی صحبت سے حاصل کیا تو جو کچھ دین ہم تک پہنچا ہے وہ صحبت کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی تقویٰ حاصل کرنے کا راستہ یہ بتا دیا کہ اگر تقویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ کسی متقی کی صحبت کا اختیار کرو، اور پھر اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے اندر بھی وہ تقویٰ پیدا فرمادیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خطبہ نکاح کی اہمیت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : جسٹس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم العالی
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ وقت : ۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعرات، بعد نماز عشاء۔
برتقریب نکاح : فرزند حاجی محمد نسیم صاحب ابنالوی۔ شفیق سنز
مقام : فاران کلب، گلشن اقبال، کراچی

تجربہ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر دلوں میں اللہ کا خوف نہ ہو۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو، اور اس بات کا ادراک نہ ہو کہ ایک دن ہمیں اللہ جل شانہ کے حضور حاضر ہو کر اپنے ایک ایک قول و فعل کا جواب دینا ہے، اس وقت تک صحیح معنی میں ایک شخص دوسرے شخص کا حق ادا نہیں کر سکتا، نہ شوہر بیوی کا حق ادا کر سکتا ہے، اور نہ بیوی شوہر کا حق ادا کر سکتی ہے،

خطبہ نکاح کی اہمیت

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد:

ابھی انشاء اللہ پر مسرت تقریب کا آغاز ہونے والا ہے، جس میں تقریب کے دولہا اور دلہن انشاء اللہ نکاح مسنون کے رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لئے اس رشتے کو مبارک فرمائے، آمین۔

شادی کی تقریبات

مجھ سے فرمائش کی گئی کہ نکاح پڑھانے سے پہلے کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں، اگرچہ شادی بیاہ کی تقریبات آج کل کے ماحول کے لحاظ سے کسی وعظ ونصیحت کی مجلس کے لئے موزوں نہیں، لیکن تقریب کو منعقد کرنے والے حضرات کی فرمائش ہے کہ اکثر حاضرین بھی اس موقع پر کوئی دین کی بات سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے حکم کی خاطر چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

خطبہ نکاح کی تین آیات

ابھی انشاء اللہ نکاح کے خطبے کا آغاز ہو گا، اور یہ خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت ہے، نکاح بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ
نکاح میری سنت ہے

(ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح، حدیث نمبر ۱۸۵۱)

شرعی اعتبار سے تو نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے جو مسنون طریقہ مقرر فرمایا، وہ یہ ہے کہ ایجاب وقبول سے پہلے ایک خطبہ دیا جائے، اس خطبہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد ہوتی ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جاتا ہے، اور عموماً قرآن کریم کی تین آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے موقع پر یہ تین آیتیں تلقین فرمائیں کہ نکاح کے خطبہ میں ان آیات کی تلاوت کی جائے، سب سے پہلے سورۃ نساء کی پہلی آیت تلاوت کی جاتی ہے:

یاایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھازوجھا وبث منھمارجالا کثیرا ونساء واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا ○

(سورۃ نساء: ۱)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ:

اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو، اور تقوی اختیار کرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (یعنی حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے) اور اسی جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا (یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو) اور ان دونوں (آدم اور حوا) کے ذریعہ دنیا میں بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے (کہ ساری دنیا کی آبادی انہیں دو مقدس میاں بیوی کی اولاد ہیں) اور اس سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کرتے ہو (جب کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے تو

وہ اکثر اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ خدا کے واسطے میرا یہ حق دے دو) اور رشتہ داریوں (کے حقوق) سے بھی ڈرو (یعنی اس کا خیال رکھو کہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال و افعال پر نگراں ہیں (وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور کیا کر رہے ہو)

یہ پہلی آیت ہے جو خطبہ نکاح میں تلاوت کی جاتی ہے، دوسری آیت سورۃ آل عمران کی ہے، وہ یہ ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ○

(سورۃ آل عمران: ۱۰۲)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (جیسا کہ اس سے) ڈرنے کا حق ہے، اور تم نہ مرو (موت نہ آئے) مگر اس حالت میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار ہو۔

تیسری آیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ نکاح میں تعلیم فرمائی، وہ یہ ہے کہ:

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا ○ یصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما ○

(سورۃ الاحزاب: ۷۰-۷۱)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

اے ایمان والو۔ اللہ سے ڈرو، اور (سیدھی) سچی بات کہو (اگر اللہ سے ڈرو گے، اور سیدھی سچی بات کہنے کی عادت ڈالو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کو قبول فرمالیں گے، اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا

تینوں آیتوں میں مشترک چیز

یہ تین آیتیں ہیں جو حضور نبی کریم، سرور دو عالم، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ نکاح کے موقع پر پڑھنے کی تعلیم دی، ان تینوں میں جو چیز قدر مشترک نظر آتی ہے، اور جس کا حکم تینوں آیتوں میں موجود ہے، وہ ہے "تقویٰ اختیار کرنا" تینوں آیتوں کا آغاز اس حکم سے ہو رہا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور تقویٰ اختیار کرو، یہ عقد نکاح کے موقع پر جو تقویٰ کا حکم دیا جارہا ہے۔ اور خاص طور پر تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی جارہی ہے، اور اس کو بار بار دھرایا جارہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یوں تو انسان کو دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنے کے لئے تقویٰ ایک لازمی شرط ہے، جس کے بغیر انسان دنیا اور آخرت میں صلاح و فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔

تقویٰ کے بغیر حقوق ادا نہیں ہو سکتے

لیکن خاص طور سے نکاح کا رشتہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے حقوق اور اس کی برکات اس وقت تک حاصل نہیں کی جاسکتیں، جب تک دونوں فریقوں کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو، تجربہ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر دلوں میں اللہ کا خوف نہ ہو، اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو، اور اس بات کا ادراک نہ ہو کہ ایک دن، ہمیں اللہ جل شانہ کے حضور حاضر ہو کر اپنے ایک ایک قول و فعل کا جواب دینا ہے، اس وقت تک صحیح معنی میں ایک شخص دوسرے شخص کا حق ادا نہیں کر سکتا، نہ شوہر بیوی کا حق ادا کر سکتا۔ نہ بیوی شوہر کا حق ادا کر سکتی ہے، نہ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا حق ادا کر سکتا ہے۔ نہ دوست دوست کا حق ادا کر سکتا ہے، یہ حق ادا کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دلوں میں اللہ کا خوف ہو، اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر جواب دہی کا احساس ہو، ورنہ محض قانون کے ذریعے، محض محکموں اور عدالتوں کے ذریعہ حقوق نہیں دلائے جاسکتے، جب تک کہ حق دینے والے کے دل میں اس بات کا احساس نہ ہو کہ اگر میں نے دوسرے کا حق مار لیا تو شاید میں عدالت اور قانون سے بچ جاؤں، لیکن اللہ تعالیٰ

کے حضور حاضر ہو کر میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہوگا، اس سے بچنے کی مجھے آج ہی تیاری کرنی ہے اور اس سے بچاؤ کا سامان کرنا ہے، جب تک یہ احساس دلوں میں پیدا نہ ہو، ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

تین آیتوں کی تلاوت سنت ہے

اس لئے خاص طور پر اس نکاح کی تقریب کے موقع پر جو خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع فرمایا، اس میں ان تین آیتوں کو مقرر فرما کر تقویٰ کی تاکید فرمائی، یوں تو ہر انسان جب مسلمان ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور تقویٰ کا عہد کرتا ہے۔

نئی زندگی کا آغاز

لیکن یہ موقع زندگی کا ایک دوراہا ہے، جس میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے، زندگی میں ایک انقلاب آرہا ہے، اس وقت میں تقویٰ کے اس عہد کو دوبارہ تازہ کریں، اور اس کی تجدید کریں، تو ان تین آیتوں کو تلاوت کرنے کا درحقیقت یہ مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ہمیں صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس موقع پر تقویٰ حاصل کرنے کی فکر اور اس کی کوشش کو تازہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ